غیر عرب دنیا اور عربی قرآن

سعید احمد راقبؔ

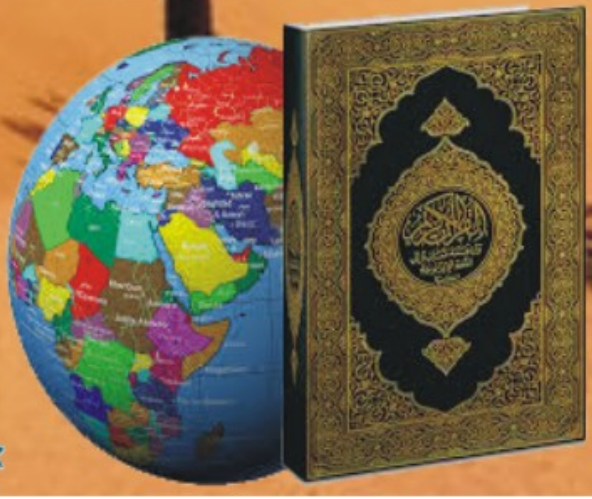

Jurat-e-Tehqiq

غیر عرب دنیا

اور

عربی قرآن

مصنف و مؤلّف

سعید احمد راقبؔ

پیشکش

جرأتِ تحقیق

www.realisticapproach.org

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

فہرست عنوانات

مضمون	صفحہ
کلمات تشکر	5
التماس	7
غیر عرب دنیااور عربی قرآن	8
دعائے خلیل اللہ	12
کیا قرآن کا ترجمہ بھی قرآن کہلا سکتا ہے؟	21
مادری زبان	29
قرآن کریم کے اوّل مخاطب	37
قومی نبوت اور قومی زبان	40
قرآن کریم کا ترجمہ	45
قرآن کریم پر تفسیروں کا بوجھ	55
عربی قرآن کن کے لئے؟	64
بنی اسمٰعیل کیوں اہلِ کتاب نہیں کہلائے	69
دینِ اسلام میں عربی قومیت کا عنصر	73
خدا کے نزدیک قرآن سمجھنے کی اہمیت	87
رسول کریم کن کی طرف مبعوث کئے گئے؟	92
یا ایھا الناس یا یاقومی	99
تبلیغ اسلام کی پالیسی	106
بنی آدم کون لوگ ہیں	113
"کنتم" خیر أمة	121
قرآن کریم کا عملِ تنسیخ	125
جمع القرآن اور اس کی حفاظت کا مسئلہ	145

تمام دنیا کے

غیر عرب مسلمان

دانشوروں کے نام

Jurat-e-Tehqiq

کلماتِ تشکر

میرے عزیز دوست باسل حجازی کے توسط سے مجھے "غیر عرب دنیا اور عربی قرآن" کا الیکٹرانک مسودہ ملا، کتاب کے پہلے باب نے ہی مجھے مصنف کے استدلال سے اس قدر متاثر کیا کہ ایک تو میں کتاب مکمل پڑھے بغیر رہ نا سکا اور دوسرے مصنف کو داد دیئے بغیر نا رہ سکا۔ اس قدر شاندار تحقیق اور طرز استدلال نے مجھے مصنف کے بارے میں سخت حیرت اور تجسس میں مبتلا کئے رکھا کہ اس قدر نادر اور اچھوتے خیال پر اس قدر عمیق، دقیق، جامع اور بسیط تحقیق کرنے والے نابغۂ روزگار مصنف آخر ہیں کون؟ سچی بات تو یہ ہے کہ مصنف نے خود مجھے انتہائی رشک میں مبتلا کر دیا کہ قرآن میرا خاص موضوع ہونے کے باوجود کبھی اس خاص موضوع پر تحقیق کرنے کا نادر خیال میرے حاشیۂ خیال سے کیوں نہ گذرا۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے، اس کا مرکزی خیال بھی انتہائی نادر ہے اور اس موضوع پر اس قدر سیر حاصل بحث اسی کتاب کا ہی خاصہ ہے، اس نادر موضوع پر میری نظر سے آج تک کوئی علمی مقالہ، تحقیق، اور کتاب نہیں گذری۔

باسل حجازی صاحب سے معلوم کیا کہ ان کے ہاتھ یہ مسودہ کہاں سے لگا؟ نیز وہ مصنف کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ تو صرف یہی معلوم ہو سکا انہیں بھی یہ مسودہ کسی دوست نے دیکھنے کیلئے دیا تھا، اور مصنف کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، میں اس کتاب کو جرات تحقیق کی الیکٹرانک لائبریری میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن معلوم نہیں تھا کہ مصنف کی جانب سے اس کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس تذبذب نے مجھے اس کتاب کو افادۂ عام کیلئے شائع کرنے سے روکے رکھا لیکن افسوس تھا کہ اس قدر عمیق، نادر اور اچھوتی تحقیق کی ناقدری ہو رہی ہے، اور یہ تحقیق اپنے

قدر دانوں تک بہتر انداز میں نہیں پہنچ پارہی، اور یہ خلش پرورش پاتی رہی۔

حسن اتفاق سے بالآخر میرا انٹرنیٹ کے توسط سے اس زرخیز ذہن کے مالک مصنف سے رابطہ ہو ہی گیا، مجھے بے پناہ مسرت ہوئی اور ان سے اس کتاب کو جرأتِ تحقیق پر شائع کرنے کی درخواست کی، جسے موصوف محترم نے انتہائی شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبول کرلیا۔

میں نے کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کے کام کا آغاز کیا، اسے کتابی شکل میں تبدیل کیا، فارمیٹنگ کی تصحیح کی، بہت باریک بینی سے پروف ریڈنگ کی اور اسے قارئین کی سہولت کیلئے پی ڈی ایف فارمیٹ میں افادہ عام کیلئے پیش کرنے کی سعادت اور اعزاز حاصل کررہاہوں۔

مصنف نے مسودہ کی تکمیل کے بعد اسے بعض ناشرین کو شائع کرنے کی پیشکش کی تھی، لیکن کتاب کے موضوع کی حساسیت کی وجہ سے کسی ناشر نے اسے شائع کرنے کی حامی نہیں بھری، مصنف نے اس کتاب سے کسی قسم کا کوئی مالی فائدہ نہ حاصل کیا ہے، نا ہی ان کی ایسی کوئی خواہش ہے، یہ کتاب افادۂ عام کیلئے نشر کی جارہی ہے، مصنف کی جانب سے کتاب کو انٹرنیٹ پر شئیر کرنے کی مکمل اجازت ہے، اس کے اقتباسات کو شائع کیا جاسکتا ہے، لیکن مصنف کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

میں بے حد ممنون ہوں جناب سعید احمد راقبؔ صاحب کا جنہوں نے انتہائی شفقت اور علم دوستی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے جرأتِ تحقیق کے پلیٹ فارم سے اس کتاب کو قارئین تک پہنچانے کیلئے اجازت مرحمت کی۔

ایازؔ نظامی

ایک التماس

قارئین سے التماس ہے کہ میں نے بعض جگہ قرآن کریم، اور احادیث نبوی ﷺ اور تاریخ کے کچھ حوالے محض اپنی یادداشت کی بنا پر لکھ دیئے ہیں، بہت ممکن ہے ان کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی بھی سرزد ہو گئی ہو جس کے لئے میں پڑھنے والوں سے معافی کا خواستگار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ انہیں خود ہی درست فرمالیں گے۔ اور تحریر کی ایسی غلطیوں کے الفاظ کو نہیں پکڑیں گے، اور مجھے اس کے لئے معاف فرمادیں گے۔

نیز میں نے اپنے دل کی بات کہنے میں کسی منافقت سے کام نہیں لیا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض جگہ میری باتیں مذہب سے جذباتی لگاؤ رکھنے والے حضرات کو کچھ ناگوار گذریں، اس لئے اگر میرے کسی جملے سے کسی کے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچے تو مجھے خود بھی اس کا بہت دکھ ہو گا جسے میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں، کیوں کہ کسی کی دل آزاری ہر گز میرا مقصد نہیں۔ کیوں کہ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے اور اپنے ایمان کی پختگی کے ساتھ خود کو بھی آزاد غور و فکر کا عادی بنائیں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی عقل بھی استعمال کرے۔

مخوف زدن از شکوہ یزداں
کہ پدر خواست پسر حرف زدے
راقبؔ

(خدا پر سوال کرنے سے نہ ڈرو کہ باپ بیٹے کے استفسار سے خوش ہوتا ہے)

شکریہ
سعید احمد راقبؔ

غیر عرب دنیااور عربی قرآن

جناب جسٹس سید امیر علی مرحوم فرماتے ہیں۔ "پیغمبر اسلام ﷺ نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ (ایک) نیم متمدن اور پرانی وضع کے معاشرے کی ضروریات پر مبنی تھے قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے وہ بھی ایسے تھے کہ اُن کی تعمیل، حالات کے مطابق کی جاسکتی تھی"۔[1]

شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کے ذریعہ کتابِ الٰہی اور سنت کے توسّل سے سب سے پہلے اصحاب الانبیاء تک پہنچتی ہے اس کے بعد شریعت آئمہ کی مختلف کسوٹیوں سے گزر کر عوام النّاس کے مختلف گروہوں تک پہنچتے پہنچتے فقہی اختلافات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ شریعت الٰہی انبیاء کرام کا زمانہ گزر جانے کے بعد مختلف فقہ کی صورتوں میں ڈھل کر فرقہ وارانہ شریعت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کسی بھی مذہب کی بنیاد عبادات، معاملات اور معاد کے عقیدے پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ عبادات کا تعلق ظاہری اور علامتی رسومات سے ہے اور معاد کا عقیدہ سے، البتہ معاملات کا تعلق دنیامیں مختلف اقوام ومذہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارنے سے ہے جو ہمیشہ دنیا کے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنے والی چیز ہے۔ معاملات ہی کا دوسرا نام شرائع ہے۔ جس کے لئے جناب جسٹس جاوید اقبال صاحب علامہ اقبال کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اقبال ایک نئے مسلم معاشرے کا قیام چاہتے تھے جس کیلئے وہ (ایک بالکل ہی نیا) علم الکلام ترتیب

1 روح اسلام، ص ۶۲۵ (اردو) انگریزی P436

دئے جانے کے خواہشمند تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآنی آیات کی تفہیم جدید سائنسی علوم کی روشنی میں کی جائے۔ اجتہاد کی بنیاد پر فقہ کی تدوینِ نو کی جائے تاکہ نئی نسل، بدلتے ہوئے حالات اور قوم کی ضروریات کے مطابق قانونی احکام کی تعبیر کر سکیں، بنیادی عبادات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں (البتہ) معاملات سب کے سب قانونی تغیر کے پابند ہیں اور مسلمانوں کی ہر نسل (یعنی دنیائے اسلام ہر پچیس ۲۵، تیس سال کے بعد) اپنی کسی پرانی نسل کی فکری تعبیر کی پابند نہیں۔ اسے یہ حق ہے کہ وہ جدید تقاضوں اور اپنی بدلتی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے مسائل کا حل خود تلاش کر سکیں[2]"۔

ایک موقعہ پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"ظاہر ہے کہ یہاں صدیوں پرانے قوانین تو نافذ نہیں ہو سکتے وقت بدل گیا ہے چنانچہ (اسلامی) قوانین (کو) زمانہ حال کے مطابق بنانے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے ایسی صورتِ حال میں (جدید) پبلک لاء اسلام کے مطابق بن سکتا ہے[3]"۔

اسی سلسلے میں جناب علامہ نیاز فتح پوری ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"اہلِ مذہب کی بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کے محامد و محاسن بیان کرتے وقت اس کا لحاظ نہیں رکھتے کہ ان کا زمانہ کیا تھا اور اُس وقت کا اقتضاء زمانہ مابعد کے واقعات سے کس حد تک مختلف تھا، وہ ایک رسول نبی کے احکام کو ایسی مکمل چیز سمجھتے ہیں کہ کبھی کسی حال میں وہ تغیّر پذیر نہیں ہو سکتے حالانکہ ہر پیغمبر اپنے زمانے کے حالات (کی مطابقت ہی) سے وضع قوانین کرتا ہے اور اُس کے سامنے مستقبل کا کوئی سوال نہیں ہوتا[4]"۔

قرآنی تعلیمات کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ:

2- روزنامہ جنگ کراچی، ص ۸ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۹۰ء

3- ایضاً مورخہ ۱۸ جون ۱۹۹۱ء

4- باب الاستفسار، نگار، مئی ۱۹۶۷ء پاکستان، ص ۱۲۰

"فطرت نے انسانوں میں دو قسم کی طبیعتیں پیدا کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ہر بات میں عقل کو دخل دیتے ہیں اور کسی بات پر، جب تک ان کی (اپنی) عقل میں نہ آئے یقین نہیں کرتے۔ دوسرے وہ ہیں جن کو اِس قسم کی بحث اور چوں چرا کا مذاق نہیں ہوتا۔ وہ جب کوئی بات کسی بزرگ یا معتقد علیہ سے سن لیتے ہیں تو اس کی لِم اور علت سے بحث نہیں کرتے، بلکہ آمنّا صدّقنا کہہ کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں"۔[5]

ایک وہ ہیں جو ماحول میں ڈھل جاتے ہیں

ایک ـــــ وہ ہیں کہ ماحول بدل دیتے ہیں

خود اللہ تعالیٰ بھی اپنی اندھی تقلید کو پسند نہیں فرماتا جیسا کہ فرمایا "اللہ کی باتوں پر بھی بے سوچے سمجھے نہ گرو" (فرقان: ۷۳) چنانچہ ابتدا میں جب اسلام اپنے مولد (جائے پیدائش) میں تھا تو فلسفہ و منطق سے نابلد ماحول میں نہایت سادہ اور غیر منطقی یعنی خالص عقیدہ پر مبنی تھا۔ لیکن جب وہ اپنے مولد سے باہر کی عقلی یعنی فلسفہ و منطق سے آشنا دنیا سے دوچار ہوا تو شروع میں اسے اپنی مفتوحہ عجمی عوام پر ناواجب سلوک کے لئے مسئلہ جبر و قدر کا سہارا لینا پڑا، لیکن بہت جلد اس کے مخلص عقیدت مندوں (معتزلہ، بانی واصل بن عطا، وفات ۱۳۱ھ) نے اپنے منطقیانہ و فلسفیانہ مباحث سے اسلام کو ایک بالکل ہی نئے مذہب یعنی مذہبِ اعتزال میں بدل دیا جو خالصتاً عقل پر مبنی مذہب تھا۔ اس مذہب نے اپنے علم الکلام کے ذریعے، جو کلیتاً عقلِ انسانی کی پیداوار تھا، اسلام کو عقلیت پسندوں کے لئے بھی قابلِ قبول بنا دیا۔ تاہم اسلام کو معتزلی آب و ہوا زیادہ عرصہ تک موافق نہیں آئی۔ چنانچہ امام ابوالحسن الاشعری (۲۶۰ھ۔۳۲۳ھ) نے دوبارہ اسے عربوں کے سادہ مذاق کے مطابق ڈھال کر اشاعرہ کا مذہب رائج کیا، مگر امام ابو منصور ماتریدی (وفات ۳۳۳ھ) کو پھر ان سے اختلاف ہوا جو دراصل عربی اور عجمی مذاق کا فرق تھا۔

چنانچہ اسلام آج تک اسی کشمکش میں مبتلا ہے کہ کیا ایک غیر متمدن اور مخصوص قوم اور

5- علم الکلام، ص:۲۲، شبلی نعمانی

حالات کیلئے نازل شدہ شرعی احکامات تمام دیگر معاشروں اور زمانوں کے لئے بھی اسی طرح براہِ راست یعنی محض قرآن اور سنت کے ذریعے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں یا نہیں، جیسا کہ یہ اپنے زمانۂ نزول میں تھے؟ آج بھی عقل اور سائنس کے مقابلے میں جو مدافعانہ کوششیں اسلام کی جدید دنیا میں بقاء کے لئے کی جارہی ہیں وہ دراصل معتزلی قسم کا ہی ردِّ عمل یا تسلسل ہے کیونکہ اسلام اس دور کے عرب معاشرے کیلئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے باوجود بھی تاویل، اجتہاد اور اجماع کا سہارا لئے بغیر کسی بھی جدید ماحول اور زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مگر مذہبِ اعتزال کے بجائے اسے نیچر السٹک یا سائنٹیفک اسلام کے طور پر پیش کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ماضیٔ قریب میں اس کی مثال شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور ان کے متبعین ہیں۔

Jurat-e-Tehqiq

دعائے خلیل اللہ

اگر ہم دعائے خلیل اللہ کے اُن الفاظ پر غور کریں کہ جس دعا کے ہمارے آنحضرت ﷺ مطلوب و مقصود ہیں تو بھی یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ محمّد رسول اللہ کی بعثت صرف اپنے خاندان یعنی تمام اولادِ ابراہیم کی طرف ہی ہوئی تھی جو کہ ایک بہت بڑی جماعت ہے جن کے جدِّ امجد حضرت ابراہیم عَلَیہِ السّلام اور ان کے دو بیٹے حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور دو پوتے یعنی حضرت قیدار اور حضرت یعقوب جن کو اسرائیل بھی کہا جاتا ہے، پر مشتمل ہیں۔ حضرت معد بن عدنان حضرت اسمٰعیل عَلَیہِ السّلام کے بارہ بیٹوں میں سے ایک فرزند قیدار بن اسمٰعیل کی اولاد عدنان میں سے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل کے باقی گیارہ بیٹوں کا حال کچھ معلوم نہیں جو قیدار کے بھائی تھے، اور دوسرے حضرت اسحاق کی اولادیں ہیں کہ یہی سب اولادِ ابراہیم کہلانے کی مستحق ہیں، لیکن حضرت ابراہیم اپنی اِس دعا میں صرف ایک محدود گروہ کے لئے اور صرف ایک شہر مکہ کے بسنے والوں کے لئے ہی امن و سلامتی اور رُشد و ہدایت کی دعا مانگتے ہیں۔ (جس میں بنی اسحاق شامل نظر نہیں آتے) اور اپنی اِس دعا میں صرف ایک بیٹے اسمٰعیل ہی کی نسل کے لوگوں کیلئے ہدایت کے طلبگار دکھائی دیتے ہیں اور پھر انہیں میں سے یعنی اپنی ہی نسل سے پیدا ہونے والے ایک نبی کی اللہ تعالیٰ سے آرزو کرتے ہیں جیسا کہ یہ سب باتیں آپ کی دعا کے الفاظ سے ظاہر ہیں۔ حضرت ابراہیم نے یہ دعا مکہ میں حضرت اسمٰعیل کے ساتھ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے مانگی تھی۔ اگر یہ دعا تورات میں ہوتی تو ہم اس کا مصداق حضرت موسیٰ کو سمجھتے:

"واذقال ابراھیم رب اجعل ھٰذا بلدًا آمِنا وّارزق"..... الخ

ترجمہ "اور جب ابراہیم نے دعا مانگی کہ اے میرے ربّ اس (شہر) کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں ان کو پھل پھلاری کھانے کو دے (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) کہ جو منکر ہو گا اس کو بھی چند روز کیلئے ہم (ان چیزوں سے) فائدہ اٹھانے دیں گے پھر (آخر کار) اس کو مجبور کر کے عذاب دوزخ میں لے جا داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔ اور جب اٹھاتے تھے ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں (یہ دعا کرتے تھے) کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ خدمت) قبول کر بیشک تو ہی سننے والا اور نیت کا جاننے والا ہے۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل (ومن ذرّیتنا اُمۃً مّسلِمۃً لک)..... میں سے ایک گروہ (پیدا کر) جو تیرا حکم بردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتائے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر بیشک تو ہی بڑا درگزر کرنے والا مہربان ہے اور اے ہمارے پروردگار اِن (مکہ والوں) میں اِن ہی میں سے ایک رسول بھیج کہ ان پر (علیھم) تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور ان کی اصلاح کرے بے شک تو ہی با اختیار صاحبِ تدبیر ہے"۔ (البقرۃ: ۱۲۶تا۱۲۹)

یہ دعا اپنے مستجاب ہونے سے ڈھائی ہزار سال پہلے مانگی گئی تھی۔

اس دعا میں قابلِ غور الفاظ یہ ہیں:

1. رب اجعل ھٰذا بلدًا .... اس شہر کو امن والا شہر بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے۔
2. واجعلنا مسلمین لک..... اور ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری ہی نسل سے ایک

امت اطاعت گزار بنا۔ (ان الفاظ سے آپ کی امت صرف ایک خاندان کی نسل تک ہی محدود رہ سکتی ہے) ان آیات میں تخصیص کے ساتھ صرف ایک شہر مکہ اور اس کے رہنے والوں کے لیے ہی دعا مانگی گئی ہے اور صرف اپنی ہی نسل سے تشکیل پانے والی ایک امت کی آرزو کی گئی ہے۔ تمام دنیا یا دیگر شہروں کا اس میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے! نیز صرف اپنی ہی نسل کے لوگوں کو اطاعت گزار بنانے کی آرزو کی گئی ہے۔

3. پھر "ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم ...... " اے ہمارے رب اور ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان پر (یعنی میری نسل کے لوگوں پر) تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب و حکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے "(البقرہ:۱۲۶تا۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی دعا سے صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ نے اِس دعا میں صرف اپنی نسل (خصوصاً بنی اسمٰعیل) کے لوگوں کے لئے ہی اور انہی میں سے ایک نبی کی تمنّا کی ہے جو ان کی اپنی ہی نسل کی ہدایت کے لئے مبعوث ہو۔

اب اگر ہمارے رسول کریم اسی دعا کے مستجاب ہونے کا نتیجہ تھے تو آپ کا دائرہ تبلیغ بھی صرف بنی اسمٰعیل یا زیادہ سے زیادہ تمام اولادِ ابراہیم تک ہی محدود ہونا چاہیئے، ورنہ آپ اُس دعا کے مصداق نہیں کہلا سکیں گے۔ اس بات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ الجمعہ کی آیت ۲ میں کر دیا ہے جس میں فرمایا:

هو الذی بعث فی الامّیین رسولاً مِّنھُم یتلُوا علیھِم اٰیٰته ویزکِّیھِم
ترجمہ وہی ہے جس نے اَن پڑھوں (غیر اہلِ کتاب) میں انہی میں
سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا
ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے (۶۲:۲)

یہ آیت تمام اولادِ ابراہیم کو حضرت ابراہیم کی وہ دعا یاد دلا رہی ہے جو آپ نے صرف اپنی ذرّیت کے لئے مانگی تھی، کیونکہ یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ آنحضرت کو صرف امیّین (جس کے معنی اکثر علماء نے غیر اہلِ کتاب کے ہی لئے ہیں) کی طرف ہی مبعوث فرمایا تھا۔

اور اس دعا یعنی "اے ہمارے رب اور ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما" کے تحت آپ کو اُنہی میں سے اُٹھایا اور آپ نے باقاعدہ طور پر صرف شروع میں تمام اولادِ ابراہیم کو تبلیغ کی اور پھر ہجرت کے بعد آہستہ آہستہ تبلیغ کو اولادِ اسمٰعیل تک ہی محدود کر لیا تھا، اور شاہانِ عجم کو مملکت عربیہ کی طرف سے قرآنی تعلیمات کے بجائے صرف سیاسی اطاعت کے لئے حکم نامے ہی ارسال فرمائے جن میں (سوائے حبشہ کے) اکثر جزیہ کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا تھا، جس کا مطالبہ اہلِ عرب سے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

اہلِ عجم کے لئے قرآن کریم کی دینی تبلیغ کا اہتمام نہ کبھی عہدِ رسالت میں کیا گیا اور نہ ہی عہدِ راشدہ میں۔ بلکہ صحابہ کرام کو قرآنی تحریروں کو عجم یا اپنے دشمنوں کے علاقے میں لے جانے تک سے منع فرمایا تھا جس کا مقصد آج کے علماء، احترام کی غرض بتاتے ہیں، مگر دراصل اس وقت اُن تحریروں میں بعض قومی بقاء کے ایسے راز پنہا تھے جن کا عجم کے دشمنوں پر عیاں ہو جانا قومی بقاء کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ آنحضرت کی زبانی تقریریں زیادہ اہم تھیں جنہیں اُس وقت تحریری طور پر محفوظ کرنے سے منع فرمادیا گیا تھا۔

سورۂ عنکبوت کی یہ آیت کہ " کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو ان کو سنائی جاتی ہے "(۲۹:۵۱) بھی مخصوص لوگوں کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اِن آیات میں عرب قوم کے علاوہ کسی اور قوم کو فیض پہنچانے کا ذکر نہیں ہے۔ ورنہ یہاں یوں کہا جاتا کہ "وہی ہے جس نے تمام دنیا کی طرف ایک رسول بھیجا جو تمام بنی نوع انسان پر اس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور بلا امتیاز ملک و ملت سب کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" اس کے برخلاف دعا میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ "اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل سے ایک جماعت (اپنی) اطاعت گزار بنا"(۲:۱۲۸)

چنانچہ جن باتوں کی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے اپنی دعاؤں میں خواہش ظاہر کی تھی وہ ایک خاص نسل کے لوگوں تک ہی محدود رکھی گئی تھی۔ اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت ۳۵ میں حضرت ابراہیم نے صرف شہر مکہ کے لئے ہی امن کی دعا مانگی تھی دنیا کی تمام آبادیوں

کے لئے نہیں۔ نیز فرمایا تھا کہ "واجنُبنِي وبَنِيَّ اَن نَّعبُدَ الاصنَام" مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بت پرست بنیں" (۱۴:۳۵) نیز دیکھئے اسی سورت کی آیات ۳۸ تا ۴۰، جن میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اِسحٰق نے اپنی تمام نسل (ذرّیتی) کے لئے دعا مانگی ہے۔ ایک دوسری جگہ بھی حضرت ابراہیم صرف اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دہرایا ہے۔ "اور یہی وصیت کی تھی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی کہ "اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے چن کر دیا تم کو دین سو تم (سب) ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان" (البقرہ:۱۳۲) اسی سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۸ میں حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ "اور ہمیں ہمارے مناسک (حج کی رسومات) بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما" (۲:۱۲۸)

چنانچہ آنحضرت نے ۱۰ھ میں جو حج "حجة الوداع" کے نام سے ادا کیا اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ آپ اپنی نسل اور قوم کے تمام لوگوں کو جو اس وقت تک مسلمان ہو چکے تھے انہیں ان کے مناسک سکھائیں، اسی لئے آپ نے فرمایا، "مجھ سے مناسِک حج اچھی طرح سیکھ لو شاید میں آئندہ سال حج نہ کر سکوں"

اسی موقعہ پر آپ نے اپنی زندگی کا وہ مشہور خطبہ بھی دیا جو ایک ساتھ تو کسی کو بھی یاد نہ رہ سکا مگر اس کے چیدہ چیدہ حصّے بعد میں صحابہ کرام سے الگ الگ جمع کئے گئے جس میں آپ نے اسلام کے تمام بنیادی اصول بیان فرمائے۔

اسی موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا کہ "جو مسلمان اس وقت یہاں موجود ہیں وہ میری ان تمام باتوں کو غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دیں" یہ ایک آخری اور نہایت ہی مناسب وقت اس بات کے اظہار کا تھا کہ اگر آپ کو تمام دنیا کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا (جبکہ یہ بات سنت اِلٰہیہ کے بھی خلاف ہوتی، سورہ ابراہیم:۴، جس میں فرمایا ہے "وما أرسلنا مِن رّسولٍ اِلّا بِلسانِ قومِہ" نیز کسی پیغمبر کا اجنبی ہونا) تو آپ اپنے اس خطبے میں اس بات کا کھل کر اظہار فرما سکتے تھے کہ "جو اس وقت یہاں موجود ہیں وہ میرے اس پیغام کو براہ راست عربی زبان میں یا تمام دیگر اقوام کی زبانوں میں ایک کے بعد ایک تراجم کرا کے تمام دنیا کے لوگوں تک تا قیامت پہنچاتے رہیں" مگر ہم

دیکھتے ہیں کہ آپ نے کوئی ایسا واضح جملہ یا اعلان اپنے اُس خطبہ میں نہیں فرمایا۔ بلکہ صرف یہی فرمایا کہ "اس وقت جو یہاں غیر حاضر ہیں تم انہیں بھی میری یہ باتیں ضرور پہنچا دینا" جو ایک نہایت سادہ سی بات تھی اور اگر ہم اسے حضرت ابراہیم کی دعا کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں جس میں آپ نے فرمایا تھا "اے میرے رب ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل سے ایک جماعت کو اپنا اطاعت گزار بنا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما"(۲:۱۲۸)، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں آنحضرت جن غیر حاضرین تک اپنی بات پہنچانے کی ہدایت فرمارہے تھے وہ اس وقت کے ہی وہ تمام مسلمان تھے جو حجّۃ الوداع میں شریک نہیں تھے جو کہ تمام کے تمام عرب قوم کے لوگ یعنی ابراہیم کی ذرّیت تھے، جن کی طرف آپ اس دعا کے مستجاب ہونے کی رو سے مبعوث فرمائے گئے تھے اور جن تک یہ پیغام پہنچنے کی صورت میں آپ کے اُس مشن کی تکمیل ہو جاتی تھی جس کی توقع اس دعا کے تحت آپ سے کی گئی تھی۔ جس کی رو سے قرآن کریم کے ان تمام خطابات کا دائرہ بھی جن میں "یا ایھا الناس، اور قل یأیّھا الناس انّی رسول اللہ الیکم جمیعا"(الاعراف:۱۵۸) فرمایا گیا تھا زیادہ سے زیادہ تمام آلِ ابراہیم تک پہنچتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمیشہ اپنی تمام تبلیغ میں صرف انہی لوگوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔

اگرچہ خدا تو ربّ العٰلمین ہے لیکن قرآن میں تمام دنیا کے شہروں میں سے صرف مکہ شہر کو ہی ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اسی لئے رسول کریم نے شہر مکہ کی ربوبیت کرنے والے رب کا حکم خصوصیت کے ساتھ اہلِ مکہ کو سنایا (اے نبی ان لوگوں سے کہو کہ) "مجھ کو تو بس یہی حکم ملا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو عزّت دی ہے" (النمل:۹۱)

اس بنا پر اہلِ مکہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ربِ کعبہ کے سب سے زیادہ شکر گزار ہوں جس نے ان کے شہر کو تمام جہانوں کے شہروں میں ایک خاص حرمت و برکت عطا فرمائی ،اور بے شک اس شہر میں رہنے والے اُس وقت قبیلہ قریش کے افراد ہی تھے جن کے لئے اللہ نے اُس دعا کے مستجاب کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کا وقفہ دیا، یہاں تک کہ فہر قریش کی کئی پشتیں اس شہر میں آباد ہو چکیں، اور آج شہر مکہ نہ صرف اہلِ عرب کے لئے بلکہ عجمی مسلمانوں

کے لئے بھی ایک بہت بڑی زیارت گاہ اور سیاحت کا مرکز بن چکا ہے۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ابراہیم کی دعا کے مطلوب و مقصود اور مصداق ہمارے نبی حضرت محمد مصطفٰے ہی ہیں، تو پھر اس کے بعد حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کی دعا کے ایک ایک لفظ کو آپ خواہ کتنی ہی بار پڑھ لیں ان سے کسی طرح یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ اس دعا کا مصداق کوئی ایسا نبی ہو سکتا ہے کہ جو عالمگیر نبی ہو یا رہتی دنیا تک کے تمام بنی نوع انساں کے لئے ہو! کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس دعا میں بجائے صرف ایک شہر کے تمام دنیا کو امن کا گہوارہ بنائے جانے کی دعا مانگی جاتی، اور یہ کہنے کے بجائے کہ "اے ہمارے رب ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل "ومن ذرّیتِنا" سے ایک فرماں بردار امّت پیدا کر" کے بجائے یہ ہوتا کہ "اے بنی نوع انسان کے رَب تو اس دنیا کے تمام بسنے والوں کو ہمارے ذریعہ سے اپنا فرماں بردار بنا اور ہم میں سے کسی ایسے شخص کو مبعوث فرما جو پوری دنیا کا درد اپنے دل میں رکھتا ہو اور جو پوری دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکے"

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دعا میں ایسی تو کوئی تمنّا نہیں کی گئی ہے کہ جس کی بنا پر ہم اس دعا کے مصداق کو تمام بنی نوع انسان کیلئے مبعوث کیا جانے والا نبی کہہ سکیں۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لقد جاءَکُم رسول من انفسکُم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکُم

ترجمہ (اے اہلِ قریش) "تمہارے پاس آیا رسول تمہارے اپنے میں سے شاق گزرتا ہے اس پر تمہارا دکھ پانا جو (تمہاری بھلائی کے لئے) تم پر حریص ہے" (التوبہ:۱۲۸)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بھی اپنی ذرّیت کی بھلائی کے لئے ہمیشہ بے حد حریص رہا کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کا امام (یعنی آپ کی پوری قوم کا امام) بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپ نے فوراً ہی دریافت کیا "قالَ ومن ذرّیتی؟" (۲:۱۲۴) اور میری اپنی اولاد کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تاریخِ حنیفیت میں ان کے پیغمبروں نے اپنے اہلیت اور اپنی قوم کے سوا کہیں بھی غیروں کیلئے کبھی کسی نیک تمنّاؤں یا خواہشات کا اظہار نہیں کیا اور اگر ان کا ذکر کبھی کیا بھی تو غیر سمجھ کر یا اپنا دشمن سمجھ کر ہی کیا! اب اس کی روشنی میں آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ عربی قرآن کن کے لئے نازل فرمایا گیا تھا۔ تمام دنیا کے لئے یا صرف اٰلِ ابراہیم کے لئے؟ اور اگر اسلام کے عالمگیر ہونے کے اس سے قوی یا واضح دلائل خود قرآن کریم، احادیث نبوی یا تاریخِ خلافتِ راشدہ سے پیش کئے جاسکتے ہیں تو وہ دلائل دنیا کے سامنے ضرور پیش کئے جانے چاہئیں، تاکہ میرے جیسے کم علم لوگوں کے ذہنوں سے ایسے تمام شبہات دور ہو سکیں۔ کیونکہ اتنے بڑے دعویٰ کو محض اشاروں کنایوں یا ذاتی عقیدت مندیوں سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کیلئے قرآن کی صرف منصوص آیات سے ہی ایسا دعویٰ کیا جاسکتا ہے یعنی نہایت ہی واضح الفاظ جن کی تاویل کی ہرگز ضرورت پیش نہ آئے، صرف انہی کے ساتھ ایسے دعویٰ کو پیش کیا جانا ضروری ہے۔

اِن دلائل کے بعد جو اس کتاب کے باقی حصوں میں پیش کئے گئے ہیں، محض قرآن و سنت یا خلفائے راشدین کے دورِ اقتدار سے اِس بات کو ثابت کرنا کم سے کم میرے لئے تو کوئی آسان کام نہیں۔ ع

ایک حلقے میں صدا سمٹی تری تقریر کی
کیا یہی تبلیغ ہے اسلام عالم گیر کی
نسیم امروہی

جہاں تک میرا خیال ہے خود قرآن نے اپنے بارے میں عالمگیر ہونے کا ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ بنو عباس کے دور کے عجمی مسلمانوں کا اسلام قبول کرنے کے جواز کے لئے قرآن سے منسوب کیا ہوا دعویٰ ہے جو غلبہ اسلام اور اس کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی برکتوں کی وجہ سے کبھی ان کی اشد ضرورت بن گیا تھا۔

مذہب محض کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے کچھ سماجی، معاشرتی، سیاسی،

معاشی اور قومی مضمرات بھی ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہ کسی غیر قوم یا مختلف معاشرے سے بھی تعلق رکھتا ہو، تو اسے قبول کرنے سے پہلے اُس کے اپنی قوم کے سماجی، معاشرتی، سیاسی، معاشی اور قومی مفادات پر پڑنے والے اثرات اور اس کے دور رس نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہئے، کہ یہ اکثریت حاصل کرنے کے بعد اپنی ہی قوم کے مفادات کے لئے مسائل بھی پیدا کر سکتا ہے اور قومی آئین پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ جو کسی خطے کے قومی اور سیاسی مفادات کیلئے نہایت مضر ہو سکتے ہیں۔

انسان کے لئے بالآخر ہر شے کا معیار خود انسان کی اپنی عقل کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ اس نے اپنی پرکھ کے لئے بھی انسان کو عقل استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ حکم دیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں انسانی عقل اتنی ہی ناقص ہوتی جتنی کہ بعض علماء بیان فرماتے ہیں تو قرآن مجید میں اس کا تقاضہ نہ کیا جاتا جبکہ یہ انسانی عقل کے میعار پر پورا بھی اترتا ہے بشرطیکہ آپ اس کے جائے نزول، زمانے اور مخاطبوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔

نوٹ: غیر اہلِ کتاب یعنی امّیین سے قرآنِ کریم کی مراد اس وقت صرف بنی اسمٰعیل ہی تھی کیونکہ اس سے پہلے قرآنِ کریم میں جن کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ صرف بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی کتابیں ہیں، دنیا کی دیگر کتابوں کا ذکر بنی اسمٰعیل کیلئے ضروری نہیں سمجھا گیا لیکن بعد میں مسلمانوں کا واسطہ عیسائیوں، اہلِ ایران اور اہلِ ہند سے پڑا تو انہوں نے تاویل کے ذریعے ان قوموں کو بھی جنگی اور معاشی مقاصد کے لئے بنی اسرائیل کی طرح اہلِ کتاب میں شامل کر لیا۔

کیا قرآن کا ترجمہ بھی قرآن کہلا سکتا ہے؟

کیا خدا نے کبھی یہ بھی چاہا تھا کہ قرآن کو ترجمہ کے ذریعہ سمجھا جائے؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر تقریر یا تحریر اپنے مخاطبوں سے خطاب کے وقت، پہلے سے ان کی علمی معلومات اور معیار و ذوق کا لحاظ رکھ کر ہی کی یا لکھی جاتی ہے، جس میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا بیان کرنا یا ان کی وضاحت کرنا اُس وقت ضروری نہیں سمجھا جاتا اور انہیں یہ فرض کر کے آگے بڑھ جانا پڑتا ہے کہ یہ بات پہلے سے ان کے علم میں ہے اور مخاطب اس بات کے مخفی اشارے و کنائے سمجھ رہے ہیں۔ نہ ہی اس وقت اِس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی ہونا ہے۔

ایک ایسے ہی سوال کا جواب علامہ اقبال میر غلام بھیک نرنگ صاحب کو اپنے اُن خطبات کے سلسلے میں دیتے ہوئے فرماتے ہیں جو آپ نے حیدرآباد اور میسور میں دئے تھے، علامہ اقبال لکھتے ہیں:

> باقی رہا (اُن) لیکچروں کے ترجمہ کا کام سو یہ ناممکن نہیں تو مشکل اور ازبس مشکل ضرور ہے (کیونکہ) اِن لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر نہیں اور اِس بات کے خواہشمند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اِس تعمیر میں میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید اِن سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والے یا سننے والوں کو اس کا پہلے سے علم حاصل ہے اس

کے بغیر چارہ نہ تھا۔" (مکاتب اقبال، حوالہ سیرتِ اقبال از محمد طاہر فاروقی، ص ۲۵۷)

انہی لیکچروں کے بارے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں:

"اقبال کی فکر ان کی نثر میں ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی فکر مربوط انداز میں اِن کے چھ لیکچروں میں نظر آتی ہے، لیکن اپنی زندگی میں نذیر نیازی سے ان کا ترجمہ کروانے کے باوجود خود علامہ کو اسے چھپوانے کی ہمّت نہ ہوئی کہ ان پر کفر کے فتوے لگادئے جائیں گے۔"[1]

یہی حال قرآنی تعلیمات کا تھا، یہ اِس لئے ضروری تھا کہ جو نصیحت یا تعلیم کسی نبی کے ذریعہ کسی قوم کو دی جارہی ہو وہ اُن کی سمجھ میں صاف صاف آجائے اور ان کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی سنت رہی ہے جسے اللہ نے کبھی ترک نہیں کیا اور کرتا بھی کیوں، جبکہ اس نے یہ فرمادیا کہ "وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا" ترجمہ، تو اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا" البتہ شریعتوں کا تعلق ہمیشہ قومی اور معاشرتی ضرورتوں پر مبنی رہاہے، شریعتوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کی سنت سے نہیں ہے اس لئے اس میں ہمیشہ قومی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ضرور رہی ہے کہ اس نے پیغمبروں کا انتخاب ہمیشہ اسی قوم سے کیا جو انہی میں رہتا اور بستا رہا ہو، وہ خود اور اس کی زبان بھی اجنبی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی بھی کوئی شریعت یا نصیحت نازل فرمائی وہ ہمیشہ اسی قوم کے کسی فرد اور انہی کی اپنی زبان میں ارسال فرمائی تاکہ وہ انہیں اچھی طرح سمجھا سکے۔

"وما ارسلنا مِن رّسول الّا بِلسان قومه"

اور جب کبھی ہم نے کوئی پیغمبر بھیجا تو (اس کو) اسی قوم کی زبان میں

(بات چیت کرتا ہوا بھیجا) تاکہ وہ ان کو اچھی طرح سمجھا سکے (ابراہیم:۴)

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مخاطبین اُس زبان تک سے واقف نہ ہوں جو ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت سے فرمایا "فَاِنّما یسّرنه بلِسانک لعلّهم یتذکّرون" (الدخان:۵۸) ترجمہ "تو (اے پیغمبر) ہم نے اِس (قرآن) کو تمہاری بولی میں

1- روزنامہ جنگ کراچی ۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء ص ۳، مضمون جناب ارشاد احمد حقانی

اس غرض سے آسان کر دیا ہے کہ یہ (یعنی اہلِ عرب اس سے) نصیحت پکڑیں" نیز سورہ مریم: ۹۷، میں بھی اسے دہرایا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیغمبر نے غیر یا ہمسایہ قوموں کا درد یا خیال بھی اپنی قوم کی طرح محسوس کیا ہو۔

وحی الٰہی کی پوری تاریخ میں کبھی ایسا بھی نہیں ہوا کہ چین والوں کو ہدایت سنسکرت میں بھیجی ہو یا فارس اور اہلِ یونان کے لئے چینی زبان میں۔ الہامی تعلیمات اور اِن کی جائے نزول کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات صاف طور پر سمجھی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ایک ایسا اصول رہا ہے جسے اس نے کبھی فراموش نہیں کیا اور تاریخ عالم سے کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں خدا نے اس اصول کو مدِ نظر نہ رکھا ہو۔ زبانوں کا سمجھنا ایک نہایت ہی نازک مسئلہ ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عموماً ہر آسمانی ہدایت میں صرف کسی ایک ہی قوم کی مخصوص بیماریوں اور گمراہیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ قرآن بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں ایک خاص قوم یعنی اولادِ ابراہیم کا ہی ذکر ہے، مثلاً تم اللہ کی آیات کو ان کی جگہ سے بدلتے ہو، تم اللہ کیلئے بیٹیاں اور اپنے لئے بیٹے رکھتے ہو، تم اپنی بیٹیوں کو قتل کرتے ہو، یا تم اللہ کی اونٹنی کو پانی پینے سے روکتے تھے وغیرہ۔ ان سب باتوں کا تعلق ایک خاص قوم کی معاشرتی زندگی سے تھا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم میں یہ برائیاں نہ پائے تو اُن پر کبھی یہ الزام بھی نہ لگا سکے گا کہ تم نے یا تمہارے آباء نے ایسا کیا۔ کیونکہ بے قصور پر الزام تہمت کہلاتی ہے، جس بات سے اللہ اپنے بندوں کو منع کرتا ہو تو خود کیونکر ایسا کر سکتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن کریم کے مخاطب صرف اولاد ابراہیم ہی ہو سکتے ہیں، پھر دوسری قومیں اُن الزامات کو کیونکر قبول کر سکتی ہے جن سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو کیونکر کسی بے تعلق کلام کو بلاوجہ خود کا مخاطب سمجھ لے جو ان سے مخاطب ہی نہ ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم عربوں پر براہ راست اور بلا تفاوتِ زمانہ، عربی رائج میں نازل ہوا، لہٰذا اُس دور کے عرب اپنے سلیقہ اور عصری مناسبت سے قرآن کی عربی کے مطالب و معانی با آسانی سمجھ لیتے تھے۔ لیکن جب وہ طبقہ گزر گیا یا اِس کتابِ مبین کا واسطہ اُن لوگوں سے پڑا جن کی نہ تو زبان ہی عربی تھی اور نہ ہی وہ اُن عربی الفاظ کی باریکیوں اور نزاکتوں کو اُن عربوں کی

طرح سمجھ سکتے تھے جیسا کہ وہ عرب اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر بلا تفسیر و تاویل مادری زبان ہونے کے ناتے سمجھ لیتے تھے، تو وہ ان کے لئے مشکل ہو گیا یعنی وہی "یسّرنا القرآن" صاف صاف سمجھ میں آنے والا قرآن جب اپنی سرزمین یعنی اپنی جائے نزول سے باہر اُن لوگوں میں پہنچا جہاں وہ مشکل اور اجنبی تھا تو اُن پر اپنے معنی کا مُحتاج بیان ہوا کیونکہ جس جگہ وہ نازل ہوا تھا یا کہئے کہ جس قوم پر وہ نازل ہوا تھا وہاں تو وہ اپنی اولاد کی طرح پہچانا جاتا تھا اور اپنے مافی الضمیر یا معنی و مفہوم کے لئے کسی لغت یا تشریح کا مُحتاج نہ تھا۔ لیکن جب وہ ایک اجنبی ماحول میں پہنچا تو ان کے لئے قدرتی طور پر اکثر مقامات میں قرآنی عبارات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں، عربوں کے مخصوص آداب و رسوم سے عدم واقفیت کی بنا پر دشواریاں پیش آنے لگیں، جن پر بعد کے علماء حق کو واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ چونکہ قرآن کے اولین مخاطب عرب اور بالخصوص قریش تھے اس لئے اِس میں ان کی زبان، عادات و رسوم اور احکاماتِ مروّجہ کی خاص رعایت رکھی گئی ہے۔ اسی لئے غیر عرب دنیا پر اس کے احکامات کی حرف با حرف پابندی بھی لازم نہیں آتی، اگرچہ قرآن ان کا حکم دیتا ہو۔ اور یہی بات غیر عرب دنیا کے لئے قومی نقطہ نظر سے الگ الگ "فقہ جدید" کی بنیاد بننی چاہئے جس پر وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی بھی ہوتی رہے۔

قرآن کریم امیینِ عرب پر عربیِ مبین یعنی قریش کے اپنے لب و لہجے میں نازل ہوا اِس لئے وہ لوگ نہ صرف اس زبان کے اسلوب و نہج اور اندازِ بیان سے خصوصی طور پر واقف تھے بلکہ وہ اس کے ادبی مقام سے بھی خوب واقف تھے جس کے ذریعہ وہ نہ صرف قرآنِ حکیم کی آیات کا صحیح مطلب اُس کے موقع و محل کی مناسبت سے بخوبی سمجھ جاتے تھے بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اِس کی عبارت میں کہاں کہاں عربی محاورے اور فصاحت و بلاغت کے کمالات دکھائے گئے ہیں اور کہاں کہاں عبارت کو مناسب الفاظ سے موزونیت بخشی گئی ہے۔ جیسا کہ جناب قاضی ابو بکر قرآنی صنف تحریر اور اس کی مقبولیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"قرآن کے اعجاز میں یہ راز پنہاں ہے کہ اِس کا اسلوب اُس دور کے تمام معروف و مروّج اسالیب سے مختلف ہے یعنی نہ تو یہ اُس (دور

کے) شعر کی طرح ہے اور نہ اُس نثر کی، جس کا اظہار اُس دور کے فصحاء اور شعراء اپنے کلام میں اکثر کیا کرتے تھے"[2]

گویا قرآنی اندازِ بیان اُس دور کی ایک ایسی جدید نثر تھی جو اپنے اندر شعر کی سی موزونیت بھی رکھتی تھی اور عربی ادب کے اُس مقام کو بھی چھو رہی تھی جسے شعراء شاعری سمجھنے پر مجبور تھے جس کا تعلق پیغام رسانی سے تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی عرب کے اُس دور کے ذوق سے بھی اس کا بہت گہرا تعلق تھا جس نے اہلِ زبان کے دلوں کو اپنی نغمیت سے بھی مسحور کر دیا تھا۔

جناب محمد حنیف ندوی جہاں قرآن کے اندازِ بیان پر مختلف آراء کا ذکر کرتے ہیں وہاں آپ اِس رائے کا بھی اظہار فرماتے ہیں کہ:

"یہ اگرچہ ٹھیٹھ نثر ہے تاہم اِس میں شعر کی تمام خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں"[3]

گویا قرآن اپنے اسلوبِ بیان میں اگرچہ نثر ہے مگر یہ اپنے اندر شعر کی پوری نغمہ سنجی بھی لئے ہوئے ہے۔

عرب گو بظاہر ان پڑھ تھے مگر قرآن کی عربی کے اعجازِ کلام سے پوری طرح واقف تھے اور اس کے محاورے اور حقیقی و مجازی جملوں سے بھی اپنی عصری مناسبت اور سخن فہمی کی بنا پر اپنے سے پہلے اور بعد میں آنے والوں پر خاص فوقیت رکھتے تھے۔ قریش کے علاوہ دوسرے عرب قرآن کو صحیح طور نہ تو پڑھ سکتے تھے اور نہ پوری طرح سمجھ سکتے تھے۔"اسی لئے قرآن کریم کی بہت سی قراءتیں تھیں۔ بعد کے لوگ ان سب کو تو محفوظ نہ رکھ سکے مگر قراءات سبعہ کو جائز قرار دینا پڑا۔"[4]

عرب میں قرآن کریم کا جن لوگوں سے واسطہ پڑنے والا تھا انہیں اپنی زباں دانی پر غرور کی حد تک فخر تھا اِس لئے ضروری تھا کہ قرآن انہیں اسی میدان میں شکست دے چنانچہ عرب جاہلیہ میں اس وقت جو اسلوبِ بیان رائج تھا قرآن کریم نے انہی کے اسلوبِ بیان کو اپنا کر ان کا مقابلہ کیا۔

2- مطالعہ قرآن، ص ۱۰۷، از جناب محمد حنیف ندوی
3- مطالعہ قرآن، ص ۱۱۳
4- دیکھئے تاریخ القرآن، ص ۱۲۶، از جناب عبدالصمد صارم

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

جناب مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، علامہ ابن قیّم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"قرآن قدماء عرب کے اسلوب پر اتارا گیا ہے۔ وہ اپنے دعوے کو مضبوط و مؤکّد کرنے کیلئے قسمیں اٹھاتے تھے لہٰذا اِسی صورتِ حال کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بھی قسمیں تاکید مرام کے لئے اُٹھائی گئی ہیں"[5]

جبکہ رب العزت کے سوا کسی کی قسم اٹھانا جائز نہیں، اور رب العٰلمین خود اپنی ہی مخلوق کی قسمیں اُٹھا رہا ہے کلامِ الٰہی میں جتنی قسمیں ہیں وہ علیٰ طریق الاستشہاد ہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ اپنی مخلوق کی قسم اُٹھانا اللہ تعالیٰ کی سنت نہیں بلکہ وقت کی ضرورت تھی۔

عرب جاہلیہ کے اس طریقِ اسلوب کی بہت سی مثالیں جناب ڈاکٹر طارق خان نے اپنے ایک مضمون میں پیش کی ہیں جس میں امرؤ القیس اور عہد جاہلیت کی ایک اور بڑی شاعرہ خنساء کے اسلوب کی خاص طور پر مثالیں دی گئی ہیں۔ (افکارِ معلّم، ص ۳۰تا۳۸، ستمبر ۱۹۹۴)

قرآنی عبارت دو پہلوؤں پر مشتمل ہے ایک ادبی اور دوسرے معنوی، کہیں اس کی عبارت پر ادبی پہلو زیادہ غالب ہے اور کہیں معنوی اور کبھی یہ دونوں یکجا بھی ہو جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ تمام قرآن پر ادبی رنگ زیادہ غالب نظر آتا ہے جس کی بنا پر قرآنی مضامین معنویت کے اعتبار سے کہیں زیادہ اپنے اندر رکھنے والی بیان کی خوبصورتی میں لاثانی ہیں۔

جناب مولانا محمد حنیف ندوی ایک جگہ "قرآن حکیم کن معنوں میں معجزہ ہے" کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(قرآن) ادب لسان یا معنی و ترتیب کے کس کس پہلو کو اجاگر کرتا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس نے مسلمانوں میں ادب و لسان کے ذوق کی تخلیق کی اور فصاحت بلاغت اور "بدیع"[6] و بیان کے نام سے مستقل فن کی بنیاد پڑی اس فن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خالصتاً اسلامی ہے اور جدید خدمتِ

5- مقدمۃ القرآن، ص ٦٦

6- بدیع کے معنی نئے اور انوکھے معنی پیدا کرنے یا پھر کسی لفظ سے ایک بالکل ہی نئی بات نکالنے کے ہیں۔

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

قرآن کا پروردہ ہے"[7]

یہی وجہ ہے جو قرآنی عبارت جس قدر اُس دور کے ذوق سے آشنا امّی فصحاء عرب کو براہ راست متاثر کر سکیں کسی اور کو بدیع و بیان کے ذریعہ بھی اپنی وہ حلاوت نہ چکھا سکیں۔ چنانچہ دیگر اقوام میں عملی دشواریوں کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عربی لغت اور قواعد کی چھان بین کی جائے۔ لہٰذا اِس بارے میں سوالات و جوابات کا ایک طویل سلسلہ نکل آیا جس کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لئے کبھی سیرتِ نبوی کو جمع کیا گیا کبھی شانِ نزول کی تلاش کی گئی اور کبھی قدیم و جدید لغات سے اس کے مطالب سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ سب سے بڑھ کر تفاسیر لکھنے والوں نے اپنے قلمی جوہر دکھانے شروع کئے بعض نے اسے ایک منفعت بخش کاروبار سمجھ کر بطور پیشہ بھی اختیار کیا، اور بے شمار تفاسیر کا ڈھیر لگا دیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور شاید قیامت تک جاری رہے گا، لیکن اس کے بر محل یعنی بلیغ اور حتمی معانی و مطالب ہمیشہ تشنہ بیان ہی رہیں گے۔

ابو جعفر طبری نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہے کہ "حضرت عمر فرماتے تھے کہ قرآن کو مجرّد رکھو اور اِس کی تفسیر نہ کرو.....(شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ قرآن کے سوا اوراق پر اور کچھ، اِس کی تفسیر یا اِس کی کسی چیز کی جو عام فہم نہ ہو شرح نہ لکھو۔"[8]

حضرت عمر نے ابنِ عباس سے دریافت فرمایا تھا کہ "یہ امّت باہم اختلاف کیوں کرنے لگے گی جب کہ اِن سب کا نبی ایک ہے۔ تو حضرت ابنِ عباس نے کہا، امیر المومنین! ہم ہی وہ لوگ ہیں جن پر قرآن نازل ہوا پس ہم نے اِس کو پڑھا اور معلوم بھی کر لیا کہ کس بارے میں وہ نازل ہوا تھا اور عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر یہ نہیں جانیں گے کہ "وہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوا تھا" تو وہ اِس میں رائے زنی کرنے لگیں گے اور (جب) رائے زنی کرنے لگیں

7- مطالعہ قرآن، ص ۱۰۴۔۱۰۵

8- ازالۃ الخفاء، جلد چہارم، ص ۲۱۱

گے تو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگیں گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں گے۔"[9]

قرآنِ کریم کے فہم کے لئے اس کی آیات کا اسبابِ نزول یا شانِ نزول کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ محمد بن سیرین کہتے ہیں میں نے عبیدہ سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حق بات کہو وہ لوگ (یعنی صحابہ کبار) گزر گئے جو یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کس بارے میں قرآن نازل فرمایا ہے۔"[10]

اس سے آپ فہم القرآن کی دشواریوں کا اندازہ بہت آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ قرآن کریم کا ترجمہ ہر گز قرآن کا قائم مقام نہیں بن سکتا۔ اور نہ ہی اُسے قرآن کہا جا سکتا ہے لفظ قرآن کا اطلاق صرف قرآن کے متن پر ہی کیا جا سکتا ہے اور جب متن کے ترجمہ پر لفظ قرآن کا اطلاق ہی نہیں ہو گا تو پھر اس کے ترجمے سے کسی پر استدلال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کہتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلے کے؟

9- اصول الفقہ الخضری، ص ۲۰۶، بحوالہ قرآن مجید کا نزول اور وحی از مولانا محمود الحسن خسرو، ص ۳۱۰

10 ایضاً، ص ۳۱۵

مادری زبان

یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ صرف مادری زبان ہی انسان کے اظہارِ خیال اور قبول تاثر کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ عام انسان اُسی زبان سے بہتر طریقہ پر افہام و تفہیم کا کام لے سکتا ہے جس زبان کے بارے میں اُسے یہ بھی یاد نہ ہو کہ اس نے وہ زبان کہاں، کب اور کیسے سیکھی، یقیناً ایسی زبان صرف وہی ہو سکتی ہے جسے کسی نے بچپن ہی سے گویائی یا نطق کا ذریعہ بنایا ہو۔ ایسی ہی زبان کو اصطلاح عام میں مادری زبان کہا جاتا ہے۔ مادری زبان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اس کے جاننے اور سمجھنے کے لئے نہ تو اُس زبان کے قوائد و ضوابط ہی کے جاننے کی ضرورت پیش آئے اور نہ ہی اس کے عام الفاظ کے مطالب سمجھنے کے لئے کبھی کسی لغت کی حاجت محسوس ہو۔

چنانچہ قرآن کریم اپنے زمانہ نزول میں اِسی طرح سمجھا یا پڑھا جاتا تھا خواہ آج اُس کے اپنے معنی و مطالب کی کسی لغت یا قواعد سے تائید ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، کیونکہ ہر مادری زبان اپنے بولنے والوں کے لئے معنی نہیں بلکہ مفہوم یا تاثر اپنے اندر رکھتی ہے۔ مثلاً ایک دیہاتی بزرگ اگر کسی پنچایت میں زور شور سے تقریر کر رہا ہو اور کوئی شخص اچانک اس سے کسی بھی عام لفظ کے معنی دریافت کر بیٹھے تو یقیناً وہ اس کے لغوی معنی بیان کرنے پر قادر نہ ہو سکے گا، حالانکہ اُس وقت وہ اور اس کے تمام مخاطب اچھی طرح اُس لفظ کا مطلب سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک اچھے استاد کی مدد سے کوئی بھی غیر ملکی زبان سیکھی جا سکتی ہے، اِس سلسلے میں جناب شیخ محمد اکرام (مؤلف، آبِ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر) ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عام طور پر ہمارے علماء کو جن کی زندگیاں ہندوستان میں گزریں، عربی زبان

میں وہ مہارت حاصل کرنا جو اہلِ زبان کا حصّہ ہے اِس قدر مشکل ہے کہ ہمیں اِس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے سوائے چند مستثنیات کے ہمارے بہترین علماء کی عربی تصانیف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیں اور عام طور پر اُن کا اثر دنیائے اسلام کی علمی زندگی پر بہت تھوڑا ہوا یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے عالم و فاضل کی عربی تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ جو جامعہ ازہر میں شامل درس (بھی) ہو گئی ہے، لیکن جن مصری طلباء سے ہمیں قیام انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہوا..... انہوں نے حجۃ اللہ البالغۃ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔".....

"عام طور پر ہندوستان میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے وہ کتابی اور قدیم ہے اور زندہ زبان میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہتیں ہیں۔"

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہر زمانے کی زبان صرف اپنے ہی علاقے اور زمانے کی ترجمان ہوتی ہے کسی دوسرے علاقے اور زمانے میں اس کا صحیح صحیح مفہوم سمجھنا آسان کام نہیں رہتا۔ جناب شیخ محمد اکرام فرماتے ہیں "ہم سے پروفیسر (ایچ۔اے۔آر) گب نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ مستشرقین کی ایک کانفرنس میں ہندوستان سے ایک صاحب اپنا مضمون عربی میں لکھ کر لائے ہوئے تھے اور انہوں نے اسی زبان میں پڑھا لیکن مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کے نمائندوں نے بعد میں کہا کہ وہ مضمون کے سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے۔ پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ چونکہ مجھے اور میرے بعض انگریز ساتھیوں کو ہندوستانی طلبہ کے پڑھانے کا تجربہ تھا اور ان کے لب ولہجہ اور لسانی خصوصیات سے واقفیت بھی تھی اس لئے ہم تو پھر بھی مضمون کو کسی حد تک سمجھ سکے لیکن مسلمان عرب علماء اُس سے یکسر محروم رہے۔"[1]

یہ تو غیر اہلِ زبان کا عربی میں اہلِ زبان کو سمجھانے کا معاملہ تھا جبکہ کسی بعید تر زمانے میں کسی غیر زبان کو غیر علاقے میں بیٹھ کر پہلے خود سمجھنا اور پھر دوسرے کو سمجھانا پڑ جائے تو معاملہ کس قدر سنگین ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہر شخص بڑی آسانی سے لگا سکتا ہے۔

1- رود کوثر، ص ۵۹۶، مطبوعہ فروز سنز، اشاعت سوم

جناب گب ایک جگہ عربی کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہوئے اِس کی ایک مثال دیتے ہیں ، آپ فرماتے ہیں: "یَقْتُلُ ترکیب سے نہ صرف قتل کرتا ہے ، وہ مار ڈالے گا، اور وہ مار رہا تھا کا مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے، بلکہ اس سے وہ شاید مار سکے گا کے معنی بھی نکلتے ہیں۔"[2]

جو لوگ مختلف زبانوں کا علم رکھتے ہیں وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ کسی زبان کا بالکل صحیح مفہوم کسی دوسری زبان میں ادا کرنا کیسی بات ہے خصوصاً جبکہ کسی کلام کا اعجاز ہی اس کا اپنے انداز میں فصیح و بلیغ ہونا قرار دے دیا گیا ہو تو ایسی صورت میں یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

فصاحت کی تعریف علماء ادب نے یہ کی ہے کہ لفظ متنافر الحروف نہ ہو اور نامانوس نہ ہو نیز قواعد عرفی کے خلاف نہ ہو[3]۔ اور یہ کہ صرف عربی کا کوئی جملہ یا عبارت ہی فصیح نہیں ہوتی بلکہ کوئی لفظ بھی فصیح یا غیر فصیح ہو سکتا ہے ، اِسے معلوم کرنے کے لئے عربی میں ایک اصول ہے ، جسے جناب مولانا سید سلیمان اشرف بہاری صاحب نے اپنی کتاب "المبین" میں پیش کیا ہے ، آپ فرماتے ہیں "اگر سامع عربی الفاظ کا لحاظ ملحوظ رکھے تو محض سن کر یہ جان سکتا ہے کہ یہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح ، مثلاً کسی سہ حرفی لفظ کو لے لو اور اِس کے حرفوں کے مخارج کی طرف غور کرو اگر ترتیب ان کی یہ ہے کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آتے ہیں تو سہولتِ ادا اُس کے فصیح ہونے کی دلیل ہے ، مثلاً ایک لفظ "عذب" جس کے معنی خوش گوار یا صاف و شیریں پانی کے ہیں ، اِس کلمہ کا پہلا حرف عین (ع) ہے اس کا مخرج حلق یعنی اعلیٰ ہے ، دوسرا حرف ذال (ذ) معجمہ ہے اس کا مخرج زبان کا کنارہ یعنی اوسط ہے ، تیسرا حرف با (ب) ہے اس کا مخرج ہونٹ یعنی ادنیٰ ہے۔ اب اگر سامع کو نہ لفظ کے معنیٰ معلوم ہیں نہ اسے اس کی خبر ہے کہ یہ لفظ "عذب" عربی کے محاورہ میں فصیح ہے یا ثقیل لیکن اسے حروف کا مخرج و مقام معلوم و محفوظ ہے تو وہ محض ترتیب مخارج سے اس لفظ کے فصیح ہونے کا علم حاصل کر سکتا ہے[4]۔" اور ہر عربی داں اس قدر ضرور جانتا ہے کہ حروف کا اپنے مخارج سے ادا کرنا نہایت ضروری ہے جو عجمی قوموں کے لئے

2- مقدمہ تاریخ ادبیات، ص ۲۰، از، ایچ۔ اے آر۔ گب مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور
3- مقالاتِ شبلی، جلد دوم، ص ۷، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ
4- المبین، ص ۷۸

آسان نہیں۔ جناب حبیب الرحمٰن شیروانی، سید سلیمان اشرف بہاری صاحب کی کتاب "المبین" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ عربی مخرج اور غیر عربوں کی دشواری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "ایک یورپین عالم کو (جو عربی کے امتحانوں میں کامیاب تھے) دعویٰ تھا کہ وہ (ع) اس کے مخرج سے ادا کر سکتے ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے حلق کی جڑ کو دباتے تھے اس کے بعد زور کر کے اس مقام سے آواز نکالنے کی سخت کوشش کرتے تھے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا آنکھیں نکل آتی تھیں مگر پوری آواز نہ نکلتی تھی[5]۔"

بھلا ایسی صورت میں کوئی غیر عرب (عجمی) عربی زبان کے ایسے جملوں کا صحیح مخرج کیونکر ادا کر سکتا ہے یا ایسے الفاظ کی فصاحت و بلاغت سے کیونکر محظوظ ہو سکتا ہے۔

لارڈ کرزن کے عربی ترجمان جناب پروفیسر مولوی حمید الدین، اپنی کتاب، "نظم القرآن و حمرہ البلاغۃ" میں لفظ "بلیغ" کے معنی بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "لغت میں بلیغ کے معنی پہنچنے والے کے ہیں اور جو چیز دل میں پہنچتی ہے وہ دراصل معنی ہیں نہ (کہ) الفاظ، چنانچہ حسنِ کلام الفاظ کا پابند نہیں اور کہ بلیغ دراصل مضمون ہوتا ہے نہ (کہ) الفاظ۔" آپ فرماتے ہیں "قرآن مجید میں جہاں بلیغ کا لفظ آیا ہے اِسی معنی میں آیا ہے، مثلاً "قل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً" یعنی اے محمد ان سے ایسی بات کہہ جو بلیغ ہو یعنی (جو) ان کے دل میں اُتر جائے[6]۔ (۴:۶۳)"

کیا ہمارے رسول اکرم اہلِ عجم کے حق میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بجالا سکتے تھے؟ یا اس اہم تقاضے کو پورا فرما سکتے تھے؟

لغت میں فصاحت کے معنی آسان تراکیب کے ساتھ کسی عبارت یا کلام کا خوبصورت اور عام فہم ہونا، اور بلاغت کے معنی بات کا حسبِ موقع یا بر محل ہونا ہے تاکہ وہ فوراً دل میں اُتر جائے۔ چنانچہ قرآن کریم آج ہمارے لئے نہ تو عام فہم ہی رہا ہے اور نہ ہی حسبِ موقع۔ اس لئے

5- ایضاً، ص ۱۱، مطبوعہ، مکتبہ قادریہ، لوہاری دروازہ، لاہور

6. مقالاتِ شبلی، ادبی، جلد دوم ص ۲۲۔۲۳، اعظم گڑھ

یہ بعد کے زمانے والوں اور خصوصاً جدید دور کی غیر عرب قوموں کے مسائل کا کوئی حل اپنے اندر نہیں رکھتا کیونکہ قرآن کریم نہ تو اُس وقت غیر عرب قوموں سے مخاطب تھا اور نہ ہی ان کے مسائل پر اس میں کوئی حسبِ موقع یا بر محل گفتگو کی گئی تھی۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں فصاحت و بلاغت کی کیا خوب تعریف کی ہے ؏

سمجھ میں سب کی آجائے فصاحت اُس کو کہتے ہیں
دلوں میں جو اُتر جائے بلاغت اُس کو کہتے ہیں

اس تعریف کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو قرآن کریم غیر عربی داں یا غیر عرب دنیا کے لئے نہ تو فصیح ہے اور نہ ہی بلیغ کیونکہ یہ اس کی عبارت کی خوبصورت تراکیب سے اُن عربوں کی طرح محظوظ نہیں ہو سکتے ہیں، اور پھر اس کی باتیں ان کے لئے بے محل ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول بھی بن جاتی ہے۔ اس لئے یہ غیر عرب دنیا کے لئے فصیح و بلیغ بھی نہیں کہلا سکتا۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں یہ بات بے دریغ کہہ سکتا ہوں کہ آج عرب کی ادبی دنیا میں اس کی فصاحت کو تو کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر بلاغت کو نہیں اس لئے کہ اب اس کی بیشتر باتیں اہلِ عرب کے لئے بھی بر محل نہیں رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں آج بھی اہلِ زبان کے لئے کسی حد تک فصاحت تو موجود ہے مگر بلاغت یعنی قبولیت کا تناسب جو کبھی سو فیصد نہ بھی سہی ستّر اسی فیصد ضرور رہا ہو گا وہ آج گھٹ کر دس فیصد بھی نہیں رہا، اس لئے کہ قرآن کریم کی عبارت میں فصاحت تو پھر بھی مل سکتی ہے مگر قبولیت یا دل میں گھر کر لینے کی صلاحیت اپنا زمانہ کھو دینے کی وجہ سے اب بہت کم رہ گئی ہے۔ مثال کے طور پر ہم سورہ کوثر کو ہی لیتے ہیں تو ہم دیکھتے کہ اس میں فصاحت تو اپنے درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے لیکن اس میں کہا کیا گیا ہے وہ واضح نہیں ہے یا کم از کم ہمارے دل میں اُتر جانے والی کوئی بات نہیں اس کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بعض اشعار اپنے الفاظ کی ترکیب میں فصاحت تو بہت لئے ہوئے ہوتے ہیں یعنی وہ نہایت خوبصورت الفاظ سے مرتب ہوتے ہیں لیکن بلاغت یا معنی اور مضمون سے خالی ہوتے ہیں، اس بات کو سمجھنے کے لئے علامہ اقبال کی شاعری کو پیش کیا جا سکتا ہے، علامہ کی شاعری میں فلسفہ، معنی اور مضمون تو

بہت بلند پایہ ہیں لیکن الفاظ کی ترکیب میں فصاحت کا التزام کچھ زیادہ ضروری نہیں سمجھا گیا جو ایسے مضمون کے لئے کچھ ضروری بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے علامہ اقبال کی وجہ شہرت فصاحت کلام نہیں بلکہ بلاغتِ کلام ہے، ان کے مقابلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو نثر بلاغت کے مقابلے میں فصاحت کا شاہکار تسلیم کی جاتی ہے۔ یعنی آپ کیا کہتے ہیں کے مقابلے میں کس طرح کہتے ہیں کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس لئے محض فصاحت میں ایک قسم کی عظمت تو ضرور ہوتی ہے مگر دل میں اُتر جانے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلے میں محض بلاغت کو تسلیم و قبولیت کا درجہ تو ضرور مل جاتا ہے مگر فصاحتِ کلام کی داد نہیں ملتی۔ ع

اُس بات میں عظمت نظر آتی ہے عموماً
جس بات کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا
محبوب خزاں

چنانچہ قریش کے چند لوگوں، اور انصار مدینہ کے علاوہ، عام عربوں نے اسلام قرآن کی کسی دلیل یا اپنی ذاتی پسند سے، محض قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر قبول نہیں کیا تھا بلکہ مکّہ کی فتح نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ اب ان کے لئے اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ رہا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف اہلِ عرب کفار کے لئے کچھ عرصے سے قتل پر مبنی دھمکی آمیز آیات بھی نازل ہونا شروع ہو چکی تھیں۔

زمانہ نبوت میں جو لوگ آپ سے واقف تھے ان میں سے اکثر صرف آپ کے دعویٰ نبوت کو سن کر یا پھر صرف کسی ایک آدھ سورت یا آیت کو سن کر بھی فوراً آپ پر ایمان لے آیا کرتے تھے، ایسے واقعات ہم تاریخ اسلام میں پڑھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے کسی صحابی کو قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے سنا اور وہ اس کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر فوراً ایمان لے آیا، حالانکہ قرآن کریم کے مضامین میں ان کے لئے کوئی بھی ایسی بات نہیں ہوا کرتی تھی کہ جس سے کوئی شخص اچنبھے میں آجائے یا اس کی کسی بات کو سن کر حیران و پریشان ہو جائے[1]۔ دراصل

1- مطالعہ قرآن ص 157، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا قرآن پر تبصرہ

جو بات ہوا کرتی تھی وہ آپ کا پاک صاف کردار تھا جس سے وہ سب ذاتی طور پر واقف بھی تھے اور جو انہی کے لئے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی باتیں انہیں سمجھاتے تھے۔ دوسرے نمبر پر ان کے لئے قرآن کریم کا وہ اعجاز کلام تھا جو اُس دور کے لوگوں کے ذوقِ ادب کو سیر کر دیا کرتا تھا، ورنہ قرآن کریم کے مضامین تو پہلے سے عرب مشرکین میں معروف عام تھے، کیونکہ قرآن کا مِن جملہ پیغام ہی یہی تھا کہ "امر بالمعروف اور نہی عَنِ المُنکر" یعنی جو باتیں نیکی کی تم میں معروف ہیں ان کا صرف اقرار ہی کافی نہیں بلکہ ان پر عمل بھی کرو اور جو باتیں برائی کی ہیں جن کا تم اپنے منہ سے اقرار بھی کرتے ہو اُنہیں ترک کر دو۔ قرآن کریم کا کمال یہ تھا کہ اس نے انہی مضامین کو ادبی پیرائے میں اس انداز سے پیش کیا کہ لوگ داد دیے بغیر نہ رہ سکے، دراصل اُس زمانے میں کلام کی داد دینا ہی ایمان کی نشانی تسلیم کر لی جاتی تھی (بشرطیکہ کوئی قبائلی یا خاندانی غرور درمیان میں نہ آتا ہو) اور یہ تقاضا تھا اِس کی فصاحت و بلاغت کا یعنی بات کا پوری طرح سمجھ میں آجانے اور حسبِ موقع اور بر محل ہونے کا۔ چنانچہ وہی قرآن بعد میں آنے والوں کے لئے، صحابہ کرام کی طرح سمجھ میں اس لئے نہیں آیا کہ اس کی باتیں اب اُس طرح بر محل نہیں رہی تھیں۔ جسے قرآن کی اصطلاح میں شانِ نزول کہا جاتا ہے۔

یہ معاملہ تو خود اہلِ عرب اور اہلِ زبان کو پیش آیا۔ اہلِ عجم کے لئے معاملہ دوسرا تھا کیونکہ قرآن براہ راست ان سے مخاطب ہی نہیں تھا اس لئے کہ یہ نہ تو ان کی مادری زبان میں تھا اور نہ ہی ان کے لئے کوئی نوید لے کر آیا تھا۔ اور وہ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے، جیسا کہ خود کبھی بنی اسمٰعیل کا اپنے سے پہلی کتابوں کے بارے میں کہنا تھا کہ "اور یقیناً ہم ان کے (غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے) پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر رہے (انعام:۱۵۶۔۱۵۷) جس بنا پر بنی اسمٰعیل کو باوجود اس حقیقت کے کہ وہ کتابیں یعنی تورات و انجیل خود انہی کے خاندان کے افراد پر نازل ہوئی تھیں، انہیں محض اس وجہ سے کہ وہ ان کی اپنی مادری زبان میں نہیں تھیں، انہیں زبردستی پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کیا جبکہ ہجرت کے کچھ عرصے کے بعد یہ بھی تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اب بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل قومی یا خاندانی اعتبار سے ایک قوم نہیں رہی ہے اور نبوت اور

ہدایت کی زبان کا قومی ہونا ہمیشہ خدا کی سنت رہا ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ سے پہلے بنی اسمٰعیل میں سے کسی نے بنی اسرائیل کے انبیاء پر ایمان لانا ضروری نہیں سمجھا ورنہ تمام بنی اسمٰعیل بھی اہلِ کتاب ہوتے۔ آپ نے بھی اپنی نبوت کو بنی اسرائیل سے تسلیم کرانے کی ایک کوشش ضرور کی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ یہی وجہ تھی جو عرب کے مسلمانوں نے غیر قوموں پر ایمان کے معاملے میں جبر سے کام نہیں لیا، اور نہ ہی تبلیغ پر کوئی توجہ دی اور صرف جزیہ سے ہی غرض رکھی۔ جس طرح قرآن نے اہلِ عرب کو تورات اور انجیل پڑھنے کا مکلّف نہیں بنایا کہ وہ ان کی مادری زبان میں نہیں تھی اسی طرح خدا کبھی بھی کسی غیر عرب قوم کو جبراً عربی قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا مکلّف نہیں بنا سکتا۔ قرآن کی تمام تعلیم کا یہی مطلب ہے جہاں تک قرآن کے ترجمے کا سوال ہے تو اس کا اعتراف ہر مترجم صاف صاف الفاظ میں کرتا ہے کہ قرآن کریم کی عبارت کا صحیح مفہوم کسی دوسری زبان میں صحت کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

Jurat-e-Tehqiq

قرآن کریم کے اوّل مخاطب

قرآن کریم کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اُس وقت تو بظاہر اس کے اوّل مخاطب اُس دور کے خاص عرب ہی بنائے گئے تھے، لیکن پھر بعد میں ترجموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ اور آئندہ آنے والی غیر عرب دنیا کی اصلاح کا کام انہی عربوں سے لینا چاہا تھا اور بعینہ اُنہیں بھی عربوں کی طرح قرآن کا مکلّف بنانا چاہا تھا! یہی خیال فہمِ قرآن کی دشواریوں کا نقطہ آغاز ہے۔

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ قرآن کریم جس طرح خاص طور پر براہ راست اہلِ عرب یا اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کو مخاطب کرتا ہے، اس طرح واضح طور پر کہیں بھی غیر عرب دنیا کو مخاطب نہیں کرتا۔ چنانچہ اِس ضرورت کو آپ نے اپنے ایجاد کردہ الفاظ سے یوں پورا کیا۔

"خدائے تعالےٰ خواست کہ بدستِ آنحضرت ﷺ عرب را پاک کند و بدستِ عرب سائرِ اقالیم را۔"[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے پسند کیا کہ آنحضرت کے ذریعے عربوں کو پاک کرے اور پھر عربوں کے ذریعہ باقی دنیا کی اصلاح کی جائے۔ اِس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن یا آنحضرت کے ذریعہ غیر عرب دنیا کو براہ راست مخاطب نہیں کیا، لیکن شاہ ولی اللہ نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ آپ نے یہ نتیجہ قرآن کریم کی کس آیت سے اخذ کیا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے یہ پسند کیا کہ عربوں سے زیادہ مہذب باقی دنیا کی اصلاح کا کام اُس زمانے کے غیر مہذب عربوں سے لیا جائے؟

مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن میں سورہ بقر کی آیت: ۱۴۲، کی تفسیر بیان کرتے

1- الفوز الکبیر، ص ۴۸

ہوئے فرماتے ہیں کہ "حضرت ابراہیم کو اقوام عالم کی امامت ملی تھی۔ انہوں نے مکہ میں امامت گاہ کعبہ تعمیر کی اور امت مسلمہ کے ظہور کی الہامی دعا مانگی۔ مشیت الٰہی میں اس ظہور کے لئے ایک خاص وقت مقرر تھا جب وہ وقت آگیا تو پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا اور ان کی تعلیم و تزکیہ سے موعودہ امّت پیدا ہو گئی اس امّت کو نیک ترین امّت ہونے کا نصب العین عطا کیا گیا[2] اور اقوامِ عالم کی ہدایت اُس کے سپرد کی گئی[3]۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر عرب دنیا کو آنحضرت کے ذریعے براہ راست مخاطب نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام بقول شاہ ولی اللہ ، جناب ابوالکلام آزاد یا صحابہ کرام کے سپرد کیا گیا تھا، جنہیں اللہ تعالیٰ نے امّۃ وسطۃ یا معتدل اور نیک ترین امّت ہونے کا لقب عطا کیا۔ (سورہ بقرہ:۱۴۲) اوّل تو اِن آیات کے مضمون کا سیاق و سباق یہ نہیں ہے کہ اہلِ عرب کو باقی تمام دنیا کی اصلاح و ہدایت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جس کی بنا پر ایسا کوئی دعویٰ کیا جائے، کیونکہ آیت کا ترجمہ ہے "اور اسی طرح ہم نے تم کو امّتِ وسطیٰ (درمیانی یا معتدل) بنایا تاکہ تم (اس وقت کے) لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنیں" یہ خطاب صحابہ کرام سے ہے نہ کہ بعد میں آنے والے تمام عرب اور غیر عرب مسلمانوں سے ! گواہی کی یہ ذمہ داری (اوّلین) صحابہ کرام تک محدود تھی، تابعین پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس کے علاوہ آلِ عمران کی آیت:۱۰۴، "ولتکن منکم امّۃ یدعون الی الخیر" اور تم (مردوں) میں سے ایک جماعت خیر کی طرف بلانے والی ہونی چاہئے۔" اس آیت سے بھی یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ "تم میں سے کچھ لوگ ہر زمانے میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا کرو۔" جو کہ اس آیت کا غلط مطلب ہے، کیونکہ اس آیت کا حکم مستقبل قریب سے ہے۔ یعنی "مِنکُم" تم جو موجود ہو، تم کو ایسا کرنا چاہئے۔ دوسرے اس آیت کا سیاق و سباق بھی یہی بتاتا ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں سے متعلق ہے جو پہلے آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ (۳:۱۰۲)

رسول کریم اور قرآن حکیم کو تمام اقوامِ عالم کیلئے ذریعہ ہدایت بنانے کیلئے مفسرین کی

2- دیکھئے اسی کتاب میں مضمون "کنتم خیر امۃ" ص۱۳۶
3- ترجمان القرآن

دشواریوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں قرآن کریم سے اس مفہوم کو بیان کرنے کیلئے سوائے اشارات یا قیاس کر لینے کے ایک بھی بلا اشتباہ اور واضح آیت میسّر نہیں آئی۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے اس مفہوم کو ادا کرنے کیلئے صرف "رب العالمین" کے معنی اقوام عالم کا رب مراد لے کر پورا کیا۔ بعض نے "یا ایھا الناس" اور "کافۃً لِلنّاس" کو اس مقصد کے اظہار کیلئے کافی سمجھ لیا، جہاں تک صحابہ کرام اور اہلِ عرب کی غیر عرب دنیا میں تبلیغی کاوشوں کا تعلق ہے تو اِس پر ایک الگ مضمون اسی کتاب میں موجود ہے[4] دوسرے اگر اِن بزرگانِ دین کا قرآن کے بارے میں یہ قیاس درست ہے تو کیا یہ اہلِ عجم کے ساتھ ناانصافی خیال نہیں کی جائے گی کہ اہلِ عرب کو تو براہ راست ہم قوم اور ہم زبان نبی کے ذریعے ہدایت پہنچائی جائے، اور اہلِ عجم کو غیر قوم اور غیر زبان کے ذریعہ، جسے نہ تو یہ خود سمجھ سکیں اور نہ کوئی دوسرا انہیں سمجھا سکے۔ یعنی "رسولاً من انفسکُم"، "رسولاً منکُم" اور "قراٰناً عربیاً لِقومٍ یعلمون" رسول تمہارے اپنے خونی رشتے سے، رسول تم ہی میں سے، اور قرآن عربی زبان کا اُس قوم کیلئے جو عربی جانتی ہے۔ جس کی مثال خود اللہ تعالیٰ نے سورہ الانعام کی آیت:۱۹-۲۰، میں دی ہے "ھٰذَا القُران" اور "یعرفُونہ کمایعرفُونَ ابنآئَھُم" شرک کرنے والے جن کے درمیان یہ قرآن نازل کیا گیا وہ اسے اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں۔ کیا اہلِ عجم پر یہ مثال صادق آتی ہے؟ یہ یا اِن جیسی دوسری آیات جن میں قرآن کی رو سے صرف عرب قوم پر ہی تمام حجّتیں قائم کی گئی ہوں کیونکر دوسری قوموں اور زبانیں بولنے والوں پر حجّت بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ جناب نسیم امروہی صاحب نے اس تمام مفہوم کو اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے، ع

ایک حلقے میں صدا سمٹی تری تقریر کی
کیا یہی تبلیغ ہے اسلام عالمگیر کی
نسیم امروہی

4- دیکھئے، اسی کتاب کا باب تبلیغ اسلام کی پالیسی، ص:۱۰۶

قومی نبوّت اور قومی زبان

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے زبان کا تعلق تفہیم سے اور نبوت کا قومی غیرت سے بتایا ہے۔زبان کی انہی نزاکتوں اور قومی غیرت کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عربوں کے لئے غیر زبان میں تفہیم کی مجبوریوں اور عزّتِ نفس کو محسوس کرتے ہوئے ،خود ہی اپنی طرف سے عربوں کے متوقع اعتراض کو برحق تسلیم کیاہے اور فرمایا:

"ولو جعلنٰہ قراٰناً اعجمیاً لّقالو الولا فُصِّلت ایاتہءَاَعجمِیّ وَّعَرَبِیّ"

اور اگر ہم قرآن کو عجمی زبان کا بناتے تو(عرب) کہتے اس کی آیتیں کیوں نہ صاف صاف بیان کی گئیں؟کیا عجمی اور عربی(زبان ہمارے لئے برابر ہو سکتی ہے؟) (حٰمٓ السجدہ:۴۴)

اگر اللہ تعالیٰ کا مقصد عرب اور عجم کو ایک برابر کا درجہ دیناہوتا،اور اِن سب کے لئے کسی ایک ہی زبان میں تعلیم نازل فرمانی ہوتی تو ہر گز عربوں کے ایسے کسی اعتراض کو قبول نہ کرتا، جوابھی انہوں نے کیا بھی نہیں تھا۔اللہ تعالیٰ کی نہ صرف یہی سنت رہی ہے کہ ہدایت کی زبان اس قوم کی اپنی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ہمیشہ یہ بھی سنت رہی ہے کہ نبی بھی اُسی قوم سے ہو۔جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن میں فرمایا"رسولاً منکُم "(اے لوگو دیکھو کہ یہ) رسول تم ہی میں سے ہے۔پھر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کہیں لوگ اس سے یہ مطلب نہ نکال لیں کہ ہم نے فرشتوں کے بجائے تمہیں انسانوں میں سے تمہارے لئے نبی پیدا کیاہے،فرمایا:

"ولو نزّلناہ علی بعضِ الاعجمِینَ فَقَرَاَہ علیھِم مّا کانُوا بہ مؤمنینَ "(الشعرآء:۱۹۸۔۱۹۹)

اور اگر ہم نازل کرتے اسے عجمیوں میں سے کسی شخص پر اور پھر وہی پڑھتا اسے
ان کے سامنے تو یہ (عرب ہونے کی بنا پر ہرگز) اس پر ایمان نہ لاتے۔"

اہلِ قریش کو آپ ﷺ پر لازمی ایمان لانے کے لئے تین خصوصی حجتیں تھیں:

ایک آپ کا رسولاً منکُم ہونا، دوسرے آپ کا ایک طویل مدّت تک، یعنی تقریباً نصف صدی اُنہی میں بود و باش رکھنا، اور تیسرے آپ کے لائے ہوئے دین کا آبائی یعنی قومی اور خاندانی ہونا، جیسا کہ فرمایا گیا، "مِلّة ابیکُم ابراھیم "(الحج: ۷۸) نیز جیسا کہ قرآن کریم میں آپ نے فرمایا "اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی (اس لئے لنّا) ہمارے لئے (مناسب) نہیں کہ ہم شریک ٹھہرائیں "(یوسف:۳۸) جبکہ باقی اہلِ عرب کے لئے صرف دو حجتیں تھیں، ایک قرآن کا خود ان کی اپنی زبان عربی میں ہونا اور دوسری دین کا قومی اور خاندانی ہونا۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر، سب سے بڑی خصوصیت دینِ قرآن کی یہ ہے کہ اس میں ہدایت کے لئے صرف اولادِ ابراہیم ہی کو دعوت دی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لقد انزلنا لیکم کتٰباً فیه ذکرکُم اَفلاتعقِلُونَ" (الانبیاء:۱۰) ترجمہ: تحقیق ہم نے تمہاری طرف جو کتاب نازل کی ہے اس میں تمہارا اپنا ہی ذکر مذکور ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اس آیت میں فیه ذکرکُم سے مراد اگر عام انسان ہوتے تو لفظ الیکم اور ذکرکُم کے بجائے "نوع انساں" اور ذکرِ "اقوامِ عالم" ہوتا۔

لہٰذا جس کتاب میں صرف کسی خاص قوم یعنی قبیلہ قریش یا زیادہ سے زیادہ آلِ ابراہیم کا ذکر ہی مذکور ہو تو وہ بھلا کیونکر غیروں کو اپنا مخاطب یا اپنی طرف متوجّہ کر سکتی ہے، جبکہ اس میں ان کا کہیں کوئی ذکر ہی نہ ہو، اس لئے کہ اس میں تو اپنے مخاطبوں سے فِیْهِ ذِکْرُکُم کہا گیا ہے۔ اس لئے اس آیت کا یہ تقاضہ ہے کہ ایسے کلام کو مذکورہ لوگوں کے علاوہ اقوامِ عالم سے منسوب نہ سمجھا جائے۔

نیز جب مشرکین نے آپ پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ کو ایک شخص یہ باتیں سکھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہی جواب دیا تھا کہ "جس شخص کی نسبت تم یہ الزام لگا رہے ہو وہ تو عجمی ہے اور یہ

قرآن صاف صاف عربی زبان میں ہے۔"(سورہ النحل:۱۰۳) چنانچہ اس سے تو یہاں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کے لئے ہدایت لانے والا صرف اور صرف عرب قوم کا ہی کوئی فرد ہونا چاہئے تھا۔ ورنہ یہاں اللہ تعالیٰ کا جواب ان کو یہ ہوتا کہ "آپ اِن سے کہہ دیجئے کہ مجھے تو میرے اللہ اور جبرائیل کے سوا کوئی دوسرا نہیں سکھاتا" اگر قوموں کی ہدایت کے لئے عربی اور عجمی یا اپنے اور غیروں کی پابندی نہ ہوتی تو اس میں عجمی اور عربی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر خدا کی سنت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے خود ایک قوم کو دوسری قوم کا زیر بارِ احسان کرے، جب اہلِ عرب کو خود انہیں کے خاندان پر نازل ہونے والی کتاب تورات کا بنی اسمٰعیل کو زیر بارِ احسان نہیں کیا تو پھر غیر عرب قوموں کو اللہ تعالیٰ کیوں کسی دوسری قوم کا احسان مند بنا سکتا ہے، جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے سورہ الشعراء: ۱۹۹، میں پہلے ہی فرمادی تھی کہ "عرب کسی عجمی نبی پر ہرگز ایمان لانے والے نہیں" تو پھر دوسری قوموں سے اللہ تعالیٰ ایسی توقع کیونکر کرسکتا تھا؟۔

عام طور پر قرآن کریم کی تفسیروں میں"رسولاً من انفسکُم "رسول تمہارے اپنے لوگوں میں سے،"من انفسِھُم " اِن ہی لوگوں میں سے، یا" منکُم " تم میں سے، کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ قرآن جنوں یا فرشتوں میں سے کسی جنس یا نوع پر نازل نہیں کیا گیا بلکہ تمہارے جیسے انسانوں میں سے ہی ایک شخص پر نازل کیا گیا ہے، حالانکہ وہاں "رسولاًمن النّاس" یا" رسولاً من البشر" نہیں آیا بلکہ "رسولاًمن انفسکُم" ہے۔ جس سے وہاں مراد تمہاری اپنی قوم، اپنا قبیلہ یا اپنی نسل سے ہے، اگر مراد نوع انساں سے ہوتی تو عربوں کے لئے کسی عجمی رسول کے نا قابلِ قبول ہونے کا عذر اللہ تعالیٰ کبھی قبول نہ کرتا کیونکہ عجمی بھی تو انسان ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورہ شعراء کی آیات ۱۹۸ اور ۱۹۹، میں فرمایا" اگر ہم اس قرآن کو عجمیوں میں سے کسی شخص پر نازل فرما دیتے اور وہی عجمی شخص اپنی زبان میں قرآن پڑھ پڑھ کر اُنہیں سناتا تو عرب ہرگز اُس پر ایمان لانے والوں میں سے نہ ہوتے۔" حالانکہ ایسی صورت میں بقول مفسرین "منکُم" یعنی تمہیں انسانوں میں سے ہونے کی بنا پر اُسے قبول کر لینے میں اُس زمانے کے عربوں کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے تھا۔

(اس جگہ میں اس بات کی وضاحت کر دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک نظریہ نبوت کا تعلق صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی نسل سے ہی متعلق ہے۔ اور یہ تحریر حضرت ابراہیم سے لے کر ہمارے نبی کریم تک کے تمام درمیانی زمانے کے دوران یا اس کے بعد کسی نئی یا پرانی نبوت کو تسلیم کرانے کا پیش خیمہ نہیں ہے، کیونکہ نبوت کا قائم کرنا اور اس کے ختم کرنے کا حق صرف اور صرف حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے سوا کسی اور کو نہیں پہنچتا۔ اور حضرت ابراہیم کے دونوں بیٹوں یعنی حضرت اسحاق اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد نے خود ہی خدا سے اِس قسم کے طریقہ ہم کلامی کو ختم کر دیا تھا، اس لئے اب اس قسم کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔)

شاید مرزا اسد اللہ غالب کو بھی یہ جرأت انہی آیات کی بنا پر ہوئی ہو جب انہوں نے کہا تھا ؏

رموزِ دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریق من عربی است

یا حضرت گرامی نے فرمایا تھا۔ ؏

حدیثِ دل بہ زبانِ نگاہ می گویم
زبانِ ما عجمی و نگاہِ ما عربی

حضرت خواجہ حافظ شیرازی ایسی ہی ایک شکایت اپنے پیر مغاں سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پیرِ معناں ز توبہ ما گر ملول شد
گو بادہ صاف کن کہ بہ عذر استادہ ایم

(اگر پیرِ مغاں کو ہماری توبہ سے کچھ رنج و ملول ہوا ہے تو کہہ دو کہ وہ بھی اپنی شراب کو صاف ستھرا کرے کہ ہم اس توبہ کے لئے ایک معقول عذر اپنے پاس رکھتے ہیں۔)

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسے عذر قابلِ قبول ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے عربوں کے ایسے عذر کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے ہی اپنی طرف سے سمجھ لیا تھا کہ اگر عربوں کو کسی غیر زبان میں نازل

شدہ کتاب پر ایمان لانے کو کہا جائے گا تو وہ اُس زبان سے اپنی عدم واقفیت کی بنا پر انکار کر کے اپنے لئے دلیل نہ بنالیں، فرمایا "ان تقُولُوٓا اِنّمآ اُنزِل الکِتٰب علیٰ طَآئِفتَین مِن قَبلِنا...... فقد جآءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُم وَهُدًى وَّرَحمَةٌ (الانعام:۱۵۶۔۱۵۷) ترجمہ: کہیں تم کہو ہم سے پہلے دو گروہوں پر تو کتاب اُتاری گئی، اور یہ کہ ہم اُن کے پڑھنے اور سمجھنے پر قادر نہ تھے، پس لو تمہارے پاس بھی تمہارے رب کی طرف سے ہدایت اور رحمت اور روشن دلیل آگئی ہے "(یعنی تمہاری سمجھ میں آنے والی کتاب) اِن آیات میں اُن سے پہلے نازل ہونے والی صرف دو کتابوں اور دو گروہوں کا ہی ذکر آیا ہے، دوسری یعنی عجمی قوموں پر اُتاری گئی کتابوں اور گروہوں کا کوئی ذکر اس لئے نہیں ہے کہ عربوں کو عجمیوں سے کبھی کوئی دلچسپی رہی ہی نہیں جو یہاں اُن کا ذکر کیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی عربوں کی ایسی تمام شکایتوں کو دور کرنے کے لئے صرف اولادِ ابراہیم پر نازل ہونے والے دو مذاہب اور اُن پر نازل ہونے والی دو کتابوں کا عربی زبان میں صحیح ترجمہ فرما کر اُن میں عربوں کے لئے جو کچھ ضروری سمجھا اُسے قائم رکھا اور جسے غیر ضروری یا عربوں کے تفنّنِ طبع کے خلاف پایا اُسے خارج کر کے خود اُسی قوم یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک معزّز ترین شخص پر نازل فرما کر اُن کے ایسے تمام اعتراضات کو رفع کر دیا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس دعا کے مصداق تھے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غیر قوموں کو اس قسم کے اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ میرے نزدیک ایسے اعتراض کرنے کا حق صرف اُسی وقت پیدا ہو گا کہ جب کوئی عربی قرآن اور کسی غیر از قوم نبی کی تعلیمات کا بعینہٖ (یعنی حرف بہ حرف) دیگر تمام قوموں کو بھی مکلّف بنانے پر زور دے۔

خدا کا شکر ہے کہ خود قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ کے سچّے رسول نے کبھی کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ لٰہذا ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول دونوں اِس قسم کے کئے جانے والے تمام اعتراضات سے بری الذمّہ ہیں۔

قرآن کریم کا ترجمہ

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری فرماتے ہیں "قرآن کا نزول اُس وقت ہوا جب کہ عرب جاہلیت کا زمانہ کمالِ عروج پر تھا، عربوں نے اُن الفاظ کو جن کا تعلق علم و فن سے تھا کلامِ پاک کی آیات میں سنا اور اس کی حقیقت کو سمجھا۔ اُن کے لئے یہ کوئی اجنبی اور بیگانہ الفاظ تو نہ تھے جو انہیں غرابت کی نظر سے دیکھتے بلکہ یہ الفاظ تو اُن کے خزینہ لغات کے بیش بہا جواہر تھے جس کی مرصع کاری (عرب میں قرآن کے ذریعہ) اسلام کی منتظر تھی[1]۔"

اس تعریف کی روشنی میں جب ہم قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو قرآن کریم ہمیں عربی ادب کا ایک ایسا شاہکار نظر آتا ہے جو اپنے مضامین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ایک عربی ادب پارہ ہے، جو ترجمہ کرنے کی چیز نہیں معلوم ہوتا۔ اسی مسئلے پر جناب غلام احمد پرویز (مدیر اعلیٰ طلوع اسلام) اپنے الفاظ میں یوں فرماتے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ خواہ دنیا کی کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا، حتیٰ کہ قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ خود عربی زبان کے الفاظ رکھ دئے جائیں تو بھی بات کچھ کی کچھ ہو جائے[2]" اس کی ایک وجہ بیان کرتے ہوئے جناب پرویز صاحب فرماتے ہیں" عرب کے لوگ کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں یعنی ان کے یہاں بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارے، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، اخفا، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے، خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔

غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں۔ قرآن کا

1- المبین، ص ۲۰۵

2- تعارف، مفہوم القرآن نیز دیکھئے، مطالب القرآن، جلد اوّل ص ۳۲۳، از غلام احمد پرویز

نزول اِن تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا قرآن کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر سکتا.... آپ مفہوم کا تو ترجمہ کر سکتے ہیں، الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتے[3]۔"اس کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں "اب یورپ کے اکثر فاضل مستشرقین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا[4]۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ قرآنی ارشادات کا ترجمہ نہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ اس عزم کا ارادہ بھی اس کے ادبی مقام کو نہ سمجھنے کا خود ہی ثبوت ہے۔ کیونکہ سوائے چند مقامات کے اس کا تمام تر تعلق عربی زبان کے ایک اعلیٰ قسم کے ادبی ذوق سے ہے جو عرب کے صرف اُسی دورِ جاہلیہ کا حصہ ہے جو موجودہ دور کے لئے ایک آثار کا درجہ رکھتا ہے۔

یہاں ہم ایک تاریخی لطیفہ درج کرتے ہیں جس کا تعلق ایک عام قسم کے ترجمے سے ہے۔" جب وسط انیسویں صدی میں انگریزی حکومت نے ہندوستان میں یورپ کی تصنیف شدہ سائنس کی کتابوں کو ترویج دینے کے لئے عربی اور مشرق کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لئے سوچا تو اِس کام کے لئے اُس وقت کے قابل ترین مستشرقین کو مقرر کیا جس کے نتائج سے حکومت کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ ان ترجمہ شدہ مضامین کو نہ تو طالبعلم ہی سمجھ سکے اور نہ ہی ان مضامین کو پڑھانے والے معلّم۔ چنانچہ تجویز کیا گیا کہ خود ان کے مترجمین ہی کو اپنے ترجموں کا مطلب سمجھانے کے لئے ملازم رکھا جائے[5]۔ خیر یہ تو نااہلی کی بات بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اب ہم یہاں آپ کو کسی اسلوبِ کلام کی نزاکت اور ذوق و معیار پر ایک واقعہ سناتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اردو نثر میں ایک خاص مقام ہے، چنانچہ جب آپ کے مکاتب "غبار خاطر" کے نام سے شائع کرنے کا اعلان ہوا تو ہندوستان کے مختلف شہروں کے پبلشروں کی طرف سے اُن خطوط کے ترجمے کی اجازت چاہی گئی۔ جناب محمد اجمل (سیکریٹری مولانا آزاد) نے ایسی تمام درخوستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اس پر مولانا آزاد نے فرمایا "چند مکاتب کے سوا تمام مکاتب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحت اور ذوق و معیار کے ساتھ

3- لغات القرآن، ص ۶۲، بحوالہ ابن قتیبہ
4- ایضاً ص ۱۳
5- انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۱۷۰، از عبداللہ یوسف علی

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اگر کیا جائے گا اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائیں گی۔" اس پر جناب محمد اجمل صاحب نے لکھ دیا کہ مولانا کے یہ مکاتب دراصل نثر میں شاعری ہے، اور شاعری ترجمہ کی چیز نہیں ہوتی۔" قرآن کریم بہر حال مولانا آزاد کی نثر سے کہیں زیادہ بلند اسلوب کا حامل ہے۔ یاد رہے کہ یہاں ترجمے سے متعلق بحث کا جس قدر بھی حصّہ ہے اُس کا تمام تر تعلق دنیا کے ادبی شہ پاروں سے ہے اور قرآن کریم ادبی شہ پاروں میں دنیا کے سب سے بلند مقام پر فائز ہے۔

قرآن کریم باقاعدہ تحریری شکل میں آنے کے بعد اپنے طرزِ نگارش میں ایک عام کتاب سے بڑھ کر کہیں زیادہ عربی دنیائے ادب کا ایک عظیم شہ پارہ ہے جس کا ترجمہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے، ہاں اس کے ادبی مقام کو زائل کر کے اس کے مفہوم کو کسی حد تک ادا کیا جا سکتا ہے خصوصاً مدنی دور کے احکاماتِ حرام و حلال اور تاریخی قصّوں کے جن کا تمام تر تعلق اُس عرب معاشرے کے اپنے ماحول اور تاریخ و تمدن سے ہے۔

جناب مولانا محمد حنیف ندوی قرآن کریم کے ترجمے کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں "ترجمے کے بارے میں اِس پیش پا افتادہ حقیقت سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے لسانیات سے ذرا بھی مس ہے کہ اس میں اصل متن کے تمام پہلو کبھی بھی اصابت و تعین کے ساتھ منعکس نہیں ہو پاتے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اس سے یا تو اصل متن و عبارت کے بعض بنیادی پہلوؤں کا سرے سے اظہار ہی نہیں ہو پاتا اور یا پھر کچھ نئے پہلو خود بخود اُبھر آتے ہیں جن کا اصل متن و عبارت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے دو بنیادی اسباب ہیں، ایک یہ کہ ہر زبان کا اپنا ایک انداز اور ڈھب ہے اور قطعاً ضروری نہیں کہ ترجمہ کرتے وقت ہم کسی بھی زبان کی خصوصیات کو دوسری زبانوں میں بعینہ منتقل کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کے ذہن کی سطح دوسرے سے مختلف ہے اس لئے ایک ہی عبارت کا دو شخص ترجمہ کریں گے تو ان دونوں میں اختلاف رونما ہونا قدرتی ہے[6]۔" آپ ہی ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص ایک زبان میں سوچے گا اور دوسری زبان میں لکھے گا تو اُس کا (بھی) یہی حشر ہو گا[7]۔" اس لئے کہا جائے گا کہ اگر کوئی شخص

6 مطالعہ قرآن، ص ۴۵، از مولانا محمد حنیف ندوی

7 ایضاً، ص ۵۱

اپنے ہی کسی ادبی مضمون کا ترجمہ خود ہی کسی دوسری زبان میں کرے گا تو اُس مضمون کا تاثُّر اور مفہوم دونوں بدل جائیں گے۔

قرآن کریم کے ترجمے کے سلسلے میں ایک نہایت اہم بحث ۱۹۳۶ء میں مصری وزارت کی ایک قرار داد کے بعد بھی شروع ہوگئی تھی اس کا ذکر جناب ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی کتاب "فلسفہ التشریع فی الاسلام" میں کیا ہے، آپ فرماتے ہیں "دوسری زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ کرنے یا اس کے معنی کی وضاحت کرنے میں بڑے بڑے مباحث ہوئے ہیں ابھی حال میں مصر میں وزارتِ مصریہ کی اِس قرار داد پر ۱۹۳۶ء میں بڑا زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا کہ قرآن مجید کا سرکاری طور پر غیر زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔...اِس پر موافقین اور مخالفین میں زبردست مباحثے شروع ہوگئے۔ ترجمے کی موافقت میں یہ دلائل دئے گئے تھے کہ روایت ہے کہ اہلِ فارس نے حضرت سلمان فارسی کو لکھا کہ ان کے لئے سورہ فاتحہ فارسی میں لکھ کر بھیج دیں۔ (افسوس کہ قرآن کریم کے اوّلین نسخوں کی طرح وہ ترجمہ بھی آج ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے) چنانچہ وہ لوگ اُسے نماز میں پڑھتے تھے اور نبی کریم نے اُنہیں منع نہیں فرمایا۔

دوسری دلیل یہ پیش کی گئی کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے فارسی اور ہر زبان میں نماز جائز قرار دی ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد نے غیر زبان میں نماز صرف اُن لوگوں کے لئے جائز کی ہے جو عربی سے واقف نہیں۔ ایک روایت ہے کہ امام ابو حنیفہ نے بھی اپنے اس قول سے رجوع کرتے ہوئے عربی زبان کے سوا اور زبانوں میں صرف اُس شخص کے لئے نماز جائز قرار دی ہے جو عربی سے بے بہرہ ہو جیسا کہ صاحبین کا مسلک ہے[8]۔"

مخالفین کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ "عربی زبان اسلام اور اہلِ اسلام کا شعائر ہے اور قرآن کریم الفاظ و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے پس اس کا ترجمہ کرنے کی صورت میں یہ تعریف باقی نہیں رہتی۔ (غالباً اسی لئے قرآن کے ترجمے پر "لفظ قرآن" کا اطلاق نہیں ہوتا) دوسرے قرآن کریم کا ترجمہ اس لئے جائز نہیں کہ ترجمہ کرنے سے دین، زبان اور وطن پر مضرت رساں اثرات پڑتے ہیں نیز یہ کہ قرآن کریم میں جو روحانیت اور نور ہے اُس کا ترجمہ

8 فلسفہ شریعتِ اسلام، ص ۱۱۰۔۱۱۱، از ڈاکٹر صبحی محمصانی

ممکن ہی نہیں بلکہ ترجمہ اسے زائل کر دیتا ہے[9]۔

یہی سوال جب سر سید احمد خان (مرحوم) سے کسی شخص نے کیا کہ اگر بجائے سورہ فاتحہ کے اِس کا ترجمہ اردو میں پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک اس میں کوئی نقصان ہے؟ سر سید احمد خان نے جواب میں ان کو لکھا کہ "نقصان تو کچھ نہیں ہے مگر نماز نہ ہو گی"۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں کہ "مذہب اور قومیت کے بارے میں ضیاء (ترکی کے مشہور شاعر) کا خیال تھا کہ ترکوں کیلئے دین اپنی زبان ہی میں دلنشین ہو سکتا ہے، اِس لئے قرآن، نماز اور اذان سب ترکی (زبان) میں ہونی چاہئیں۔ علامہ اقبال اِس حد تک متفق ہیں (کہ ہونی چاہئیں) لیکن فرماتے ہیں کہ ابن تومر بربری نے جب اندلس میں حکومت قائم کی اور موحدین کو اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ قرآن کا ترجمہ بربری زبان میں ہونا چاہئے۔ اذان اور نماز اور (ان کے علاوہ بھی) تمام عبادات میں بربری زبان استعمال ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ترک اِس خیال کے (تنہا) موجد نہیں[10]۔"

اس تمام بحث سے بھی اگر صرف خشوع کی خاطر نماز کے عربی کلمات کا ترجمہ جائز قرار دے دیا جائے تو مشکل یہ ہے کہ سورہ فاتحہ اور رکوع و سجود کے علاوہ نماز میں پڑھی جانے والی دوسری بہت سی چھوٹی بڑی سورتوں کا تعلق خالص خدا کی حمد و ثنا سے نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اِس مسئلہ پر عالمِ اسلام میں کبھی بھی اتفاق نہیں ہو سکا۔

ترجمہ کی دشواریوں پر پروفیسر گِب لکھتے ہیں:

"الغرض عربی متن میں بقول بعض لوگوں کے صرف پچھتّر ۷۵ فیصد معنی موجود ہوتے ہیں اور بقایا پچیس ۲۵ فیصد پڑھنے والے کو خود مہیا کرنے پڑتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متن میں ہر لفظ کے معنی جاننے اور نحوی ترکیب کو سمجھنے کے بعد بھی دو بالکل مختلف معنوں کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے، اس طریق سے طلباءِ یورپ ہی محروم نہیں رہتے بلکہ مقامی طلباء سے بھی اکثر اوقات غلطی ہو جاتی ہے، تاوقتِ

9 ایضاً، ص ۱۱۱
10 فکر اقبال، ص ۴۸۷

کہ وہ زبانی روایات کی طرف جو تحریری متن کی معاون ہوتی ہیں رجوع نہ کریں[11]۔ جس کی وجہ سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے اُس دور کی تمام زبانی روایات جو عربوں میں تورات و انجیل وغیرہ کی وجہ سے معروفِ عام ہو چکی تھیں اُن سے بھی واقفیت رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پروفیسر گب فرماتے ہیں "یہ کتاب (قرآن) بھی جتنا اپنے ادبی کمالات کی وجہ سے ممتاز ہے اتنا ہی اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی ناممکن ہے۔[12]"

جناب شیخ محمد اکرام فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں، ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج جب کہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علماء و ادباء نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے۔ (مگر اس کے باوجود) ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں ہے جسے تسلّی بخش کہا جاسکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے[13]۔

قرآن کریم کے ترجموں اور معنی و مفہوم کے اختلاف سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ مسلمانوں کے درمیان قرآن صرف حرفاً حرفاً یا متن کے اعتبار سے ہی متفق علیہ ہے تفسیر و معانی کے اعتبار سے نہیں۔ ترجمے کی یہی دشواریاں ہیں جو آج ہر شخص قرآن کا اپنے اپنے علم، عقیدے اور فہم کے مطابق جیسا چاہے ترجمہ کر لیتا ہے۔ اور وہ باوجود مختلف ہونے کے غلط نہیں کہا جاسکتا یا غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ع

ہزاراں معنی باریک باشد بیت ابرورا
بغیر از موشگافاں کس نہ فہمد معنی اورا

11- مقدمہ تاریخ ادبیاتِ عرب، ص ۲۱
12- ایضاً، ص ۴۸،
13- رود کوثر، ص ۵۲۰

کیونکہ اس میں کہیں تو لغت سے مدد لی جاتی ہے کہیں مجموعی مفہوم کو مد نظر رکھا جاتا ہے، کہیں اپنے مخصوص عقائد کی حفاظت پیش نظر ہوتی ہے، کبھی ترجمہ شان نزول کو ذہن میں رکھ کر کیا جاتا ہے، تو کبھی اسرائیلیات سے پورا پورا استفادہ کیا جاتا ہے کبھی طول طویل تفسیر کی مدد سے عبارت کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے پاژند کی یاد تازہ ہو جاتی ہے بعض جگہ حقیقی اور مجازی معنوں کی بحث زیر غور آتی ہے۔ بعض عالم اپنے ترجمے کا بڑی تحقیق کے بعد محاوراتِ عرب جاہلیہ کے عین مطابق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور باطنی معنی اس پر مستزاد ہیں۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا تھا کہ "جب کبھی تمہیں قرآن کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو اس کا حل شعرائے عرب کے کلام میں ڈھونڈو کیونکہ وہ عرب قوم کا صحیفہ ہے[14]۔" گویا آج قرآن کو محض قرآن سے سمجھنا ایک پیچیدہ عمل ہو گیا ہے۔

قرآن کریم کے ترجمے کی کچھ دشواریاں اس کے اپنے ایک خاص اسلوبِ بیان کی وجہ سے اکثر مقامات میں ضمائر کے مراجع کی بھی ہیں جس کی وجہ سے اکثر ایک ہی عبارت کے کئی کئی الگ معنی و مفہوم بن جاتے ہیں جس سے خود براہ راست عربی زبان میں پڑھنے والے بھی نہیں بچ سکتے۔

غرض آج کے ایسے تمام تراجم و تفاسیر کو دیکھ کر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسی ایک قرآن کی عبارت کے ابھی بہت سے نئے نئے معنی و مفہوم کی گنجائش باقی ہے، اس لئے کہ ہمارے تمام موجودہ ترجمے کسی ایک مستند ترجمے کی نقلیں نہیں ہیں اور تفسیریں بھی الگ الگ ہیں انہیں دیکھ کر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے درمیان معنی و مفہوم دونوں کے اعتبار سے متفق علیہ ہے۔ یہی قرآن جو آج سے چودہ سو سال پہلے اپنی مخاطب قوم عرب کے درمیان اتحاد کا باعث بنا تھا، آج اپنی تفہیم کی مشکلات کی وجہ سے مختلف اقوام اور مسلک کے ماننے والوں کے درمیان تفرقے کا باعث بنا ہوا ہے۔ اسی لئے ادیان ہمیشہ قومی اور علاقائی رہے۔

جدید دور کے علماء کے لئے آج سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کریم کے متن کا ترجمہ قرآنی مفہوم کو دوسری زبانوں میں کسی قدر سمجھنے کے قابل تو بنا دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس

14- روح اسلام، ص ۴۶۵، انگریزی، P-306 از جناب سید امیر علی

کے معنوں کو مقید و متعین بھی کر دیتا ہے جس سے زمانے اور حالات کے بدل جانے یا علم کی ترقی سے کچھ عرصہ کے بعد متن کے بعض معنی فرسودہ معلوم ہونے لگ جاتے ہیں۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے جناب شمس نوید عثمانی فرماتے ہیں۔ "یہ کلام الٰہی کا اعجاز ہے کہ وہی الفاظ بدلنے والے زمانہ کی ترقی کا ساتھ ہر دور میں دیتے ہیں، الفاظ تبدیل نہیں ہوتے، ان کے مفہوم تبدیل ہو جاتے ہیں۔ قرآن عزیز کے الفاظ سے مختلف زمانوں میں مختلف مفہوم اخذ کئے جانے پر ممکن ہے کچھ حضرات کو اتفاق نہ ہو۔ موجودہ دور میں تدبّر فی القرآن کا دروازہ بالکل بند ہو جانے سے ایسا جمود پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے مفاہیم کو بھی جامد سمجھا جانے لگا ہے اور یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی ہے کہ اس کے تمام رموز و اسرار کھولنے کا حق ادا ہو چکا۔ ہماری تفاسیر کے ذخیروں میں سب سے آخری تفسیر بھی پچاس سال پرانی ہو گئی، جبکہ مادی ترقی کی رفتار آج اتنی تیز ہے جتنی کبھی نہ تھی۔ اگر جلد ہی امّت میں ایسے افراد سامنے نہ آسکے جو جدید علوم سے واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن فہمی کے (بھی) اہل ہوں، تو وہ وقت سر پر ہے جب قرآن پر فرسودہ (out dated) ہونے کا الزام آجائے گا[15]۔"

ہمارے خیال میں کسی بھی قوم کی نئی نسل کو ماضی کے سنوارنے کے اس مشکل اور کارِ عبث پر لگانے کے بجائے بہتر ہو گا کہ انہیں اپنے مستقبل کو تابناک بنانے اور سائنس کے میدان میں جدید تحقیقات کرنے کا مشورہ دیا جائے۔

قرآن کریم سے ہماری سچّی عقیدت نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کام کرایا ہے۔ ایک بار عربی ادب کے اس شہ پارے کو یونانی فلسفے کا گاؤن پہنا کر یونانی اکیڈمی سے فلسفے کی اعزازی ڈگری بھی دلائی گئی تھی جسے بعض حلقوں نے پسند کیا تھا اور بعض نے نہیں پھر جب دنیا پر سائنس کا غلبہ نظر آنے لگا تو کوشش کی جانے لگی کہ اسے سائنس کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا جائے، جو کلام الٰہی کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ مثلاً سورہ لقمان کی آیت: ۳۴ کو لیجئے ترجمہ "اور وہ (ہی) جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے۔" جدید میڈیکل سائنس کے انکشافات کے ساتھ ساتھ اس آیت کے

15- تالیف از جناب ایس عبد اللہ طارق، ص ۱۶۷، پتہ بازار نصر اللہ خان، رام پور، بھارت

مختلف ادوار میں مختلف معنی لئے جاتے رہے۔ جبکہ آج انسان کے لئے اس جیسے رحم کے رازوں کو معلوم کرنا عام سی بات بن گئی ہے۔

قرآن کریم کے ہر دور میں بدلتے ہوئے معنی و مفہوم کی دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے جناب حسن الاعظمی (الازہری)، جناب رشید رضا (مدیر المنار) کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس سے بالکل مختلف بات فرماتے ہیں کہ "گذشتہ بیشتر تفاسیر میں اوّلاً لفظی اصطلاحات کے مناقشے یا متکلمانہ جدلی طریقے اور صوفیانہ تاویلات اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بوچھاڑ نظر آتی ہے۔ امام فخر الدین رازی نے سونے پر سہاگہ یہ کیا کہ اپنی تفسیر میں اپنے زمانے کے مشہور و معروف علمی آراء و نظریات کو پیش کر دیا۔ انہی کی تقلید موجودہ دور کے ایک مفسر (شیخ طنطاوی) نے کی کیونکہ وہ جابجا جدید علوم مثلاً علم فلک، علم نباتات، علم حیوانات پر تفسیر الآیۃ کے ذیل میں بحث کرتے ہیں" آپ فرماتے ہیں، "اس میں شک نہیں کہ بعض علومِ جدید فہم قرآن کے لئے ضروری ہیں یا اس کی تفہیم پر ممد و معاون ہیں، لیکن رشید رضا کا خیال یہ ہے کہ ان علوم کو حدِ بعید تک استعمال کرنا جیسا کہ مفسرین نے کیا، پڑھنے والوں کو اُس حقیقی مقصد سے دور کر دیتا ہے، جس کے لئے قرآن نازل ہوا[16]۔ "کیونکہ ہم سے پہلے کبار صحابہ کرام نے ان جدید علوم کے انکشافات کے بغیر ہی قرآن کریم کے مقصد نزول کی مکمل فہم حاصل کرلی تھی۔ مگر صحابہ کرام کے گذر جانے کے بعد سے پھر آج تک کسی بھی دور کے مسلمان قرآنی متن کے ویسے واضح اور حتمی معنی و مفہوم متعین نہیں کر سکے اس کی کوئی تو وجہ ضرور ہو گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریری الفاظ برہنہ جسموں کی مانند ہوتے ہیں، معنی ہی اُنہیں لباس بخشتے ہیں جو ان کے مفہوم کی شناخت بنتے ہیں۔ اگر کسی ایک ہی چہرہ رکھنے والے مختلف مجسموں یا تصویروں کو الگ الگ لباس زیب تن کر دئے جائیں تو اُس چہرے کی اپنی قومی شناخت مشکل ہو جائے گی، اور اس کی جائے پیدائش، زمانہ اور نام بھی مشکوک ہو جائے گا۔ جیسے کسی اکیسویں صدی کے علوم و ترقی سے آراستہ قرآن کریم کے صرف ترجمے کو دکھا کر کوئی کسی ماہر نقاد سے سوال کرے کہ بتاؤ یہ کس زمانے کی تصنیف ہے تو یقیناً اس کا جواب گمراہ کن ہو گا۔

16- محمد عبدہٗ اور پان اسلام ازم، ص ۳۳۸

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

قرآن کریم کو ہر زمانے کے مطابق ترجموں یا نئی نئی تفسیروں کے ذریعہ سے ہر دور میں نئے نئے معنی پہنا دینا بھی اس کے اصل معنی و مفہوم میں ترمیم و تنسیخ کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے اصل معنی و مفہوم، اس کے زمانہ نزول میں بھی سوائے صحابہ کرام کے کوئی اور نہیں جان سکا تھا اسی لئے اُنہیں اس کے معنوں کی بھی کوئی جستجو نہیں تھی، یہ صرف اُنہی سے مخاطب تھا اور صرف اُنہیں کے لئے نازل کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام کے بعد جب قرآن دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا تو اس کو سمجھنے کے لئے تفسیروں، لغت اور اشعار جاہلیہ کی ضرورت پیش آئی، اور عجم کی مسلمان قوموں نے اسے اپنا سرمایہ حیات بنانے اور اپنا کام چلانے کے لئے اس کے ترجموں اور صحابہ کرام کے بعد میں آنے والے عربوں اور عجمیوں کی پرانی تفسیروں پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی ؏

تاریخ کو دہرانے کی کوشش میں کلامی
کرتے ہیں عطا حال کو ماضی کا لبادہ

راقِبؔ

Jurat-e-Tehqiq

قرآن کریم پر تفسیروں کا بوجھ

قرآن کریم کے ترجموں اور تفسیری مسائل کو سمجھنے کے لئے آپ صرف سر سید احمد خان کے تفسیری مضامین، یا قرآن کی کسی بھی دو تفسیروں کا مطالعہ کرلیں تو کافی ہو گا۔ یا مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال میں شائع شدہ مضامین کا مطالعہ کرلیں جو مولانا غلام رسول مہر صاحب نے کتابی شکل میں "انبیاء کرام" کے نام سے شائع کر دئے ہیں یا پھر علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا "تذکرہ" اور یا پھر اس کا خلاصہ "حدیث القرآن"۔ اگر آپ نے سرسری طور پر ان سے پہلے قرآن کریم کا کوئی عام ترجمہ پڑھا ہوا ہو تو آپ کو شاید ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے پہلے کبھی قرآن غور سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ ان میں آپ کو وہ اضافی مضامین بھی ملیں گے جو قرآن کریم کا حصّہ تو نہیں مگر ان حضرات کے نزدیک اس کی تفہیم کا حصّہ ضرور ہیں۔ مثلاً علامہ مشرقی نے اسی چودہ سو سال سے پڑھے جانے والے قرآن کو پڑھ کر اس کی ایک بالکل ہی نئی تشریح پیش کی ہے، جس میں وفات پا جانے کے بعد کی جنت و دوزخ کو اسی موجودہ ارضی زندگی سے متعلق بتایا گیا ہے۔ یعنی جنت کے معنی ارضی بادشاہت جو فرداً فرداً ہر شخص کو نہیں مگر قومی نقطہ نظر سے قوم کے کسی معزز ترین شخص کو عطا کر دی جائے گی اور دوزخ یا جہنم کو بھی قومی اعتبار سے کسی دوسری قوموں کی غلامی میں چلے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور الکتاب سے مراد صحیفہ فطرت کا علم یعنی سائنسی علوم، جس سے تسخیر کائنات کر کے انسان ایک نہ ایک دن خدا کے روبرو جا کھڑا ہو گا۔ (حدیث القرآن، ص ۲۶) یہاں علامہ مشرقی نے جنت و دوزخ سے متعلق آیات کی جو تشریح کی ہے اس سے حیات بعد الموت اور جنت کا وہ حسین تصور جو قرآن کریم کافی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

مجھے آریہ سماج کی طرف سے شائع ہونے والی تفسیر قرآن کا کچھ حصّہ دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے جو ان کی طرف سے "وید اور قرآن" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے قرآن کی تمام تر بنیادی تعلیمات کو وید مقدس، سمرتیوں اور اپنیشدوں کی بنیادی تعلیمات کے عین مطابق ہونا ثابت کیا ہے[1]۔

اگرچہ ان سب لوگوں میں نیک نیتی، عقیدت اور خلوص شامل ہوتا ہے لیکن ہمارے علماء کی حدِ اعتدال سے زیادہ عقیدت اور خلوص نے جہاں بدیع و بیان کے کمالات دکھائے ہیں وہاں بات کو بہت الجھا بھی دیا ہے۔ چنانچہ آج کا ایک عام انسان جو قرآن کریم کو صرف ترجموں کے ذریعہ ہی پڑھ سکتا ہے، ان مختلف و متضاد ترجموں کو پڑھ کر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے۔ ع

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

شاید علامہ اقبال نے ایک ہی قرآن کے بے شمار تراجم و تفاسیر کو دیکھ کر یہ شعر کہا ہو گا۔ ع

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

جیسا کہ جناب عرشی صاحب نے فرمایا: "تفسیرِ قرآن کی دنیا جو گذشتہ چودہ صدیوں میں تخلیق ہوئی اس کی سیر کے لئے عمرِ نوح بھی ناکافی ہے، شاید عمرِ خضر کچھ کفایت کر سکے، پھر اس میں اقسام و انواع پر نظر کی جائے تو افادیت کم سے کم اور تضیعِ وقت (زیادہ)[2]" آپ آگے لکھتے ہیں: "فہم قرآن میں اختلاف قرونِ اوّل ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ "التفسیر والمفسرون" کی پہلی جلد میں ہمیں یہ عنوان بھی نظر آتا ہے، "تفاوت الصحابہ فی فہم القرآن[3] "

اس کی ایک مثال ایسے شعراء کے کلام سے بھی دی جا سکتی ہے جن کے سامعین کا ذوق و معیار اتنا بلند نہ ہو کہ وہ اسے سمجھ سکیں یا پھر درمیان میں تفاوت زمانہ حائل ہو جائے۔ جس کی وجہ سے اُس فن کے اساتذہ کو ان کے کلام پر متعدد شرحیں لکھنی پڑ جائیں۔ یہ بات ہر شخص بخوبی جانتا

1- دیکھئے، وید اور قرآن، از لکشمن آریہ اپدیشک، دہلی
2- قرآن سے قرآن تک، ص ۳۴
3- ایضاً، ص ۳۶

ہے کہ ایسی دشواریاں جب ہی پیش آتی ہیں جب کوئی عبارت یا تو خود واضح نہ ہو یا پھر متکلم کے سامع اُس کے اصل مخاطب ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے وہ تحریر یا کلام ان کے لئے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کریم کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اُس خاص دور کے عربی بولنے والوں کے علاوہ تمام دوسری زبانیں بولنے والوں پر بھی (اللہ تعالیٰ کے) اس قول "یسّر" کا یکساں اطلاق ہوتا ہے، درست معلوم نہیں ہوتا۔ مگر یہ اعتراض تو جب ہی عائد ہو سکتا ہے کہ جب اس کی طرف سے یہ دعویٰ منسوب کیا جائے کہ یہ اپنے تمام سننے والوں پر بھی اسی طرح آسان بنا کر نازل کیا گیا ہے کہ جس طرح اُس دور کے امیوں پر آسان بنا کر نازل کیا گیا تھا۔

فہم قرآن کی یہی دشواریاں تھیں جس کا اعتراف جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے ان الفاظ میں کیا تھا کہ "اگر تم رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی گہرائیوں کو سمجھنا چاہو تو پہلے عرب امیوں کی تحقیق کرو جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے وہی دراصل آپ کی شریعت کا تشریحی مادہ ہے..... اس کے بعد آپ کی اصلاح کی کیفیت سمجھو جو آپ نے اُن مقاصد کے تحت تشریح و تیسیر اور احکامِ ملت (ملّةَ أبيكم إبراهيم، یعنی اولاد ابراہیم) کے باب میں کی ہیں[4]۔ گویا عربوں کے علاوہ دیگر مسلم اقوام پر علماء اسلام نے خدا سے پوچھے بغیر ہی ایک اضافی بوجھ از خود ڈال دیا کہ پہلے عرب امیوں کے معاشرے کی تحقیق بھی کرو جو ایک عام غیر عرب مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم کو ہم اس کے اپنے زمانے یا ماحول اور معاشرے سے الگ رکھ کر سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو فہم قرآن کے اس جملے کے کیا معنی لئے جاسکتے ہیں کہ:

"فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ..." (الدخان:۵۸، اور مریم: ۹۷)

پس اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے اسے تمہاری اپنی زبان میں آسان بنا دیا ہے
تاکہ یہ تمہارے لئے خوشخبری ہو اور تم نصیحت پکڑو"

پس ان آیات کی بنا پر عربی قرآن سرے سے اُن اقوام سے مخاطب ہی نہیں جن کی زبان

4- حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۲۳، بحوالہ فقہ اسلامی، از مولانا محمد تقی امینی، ص ۱۱۳،

عربی نہیں۔ اس لئے اب قرآن کریم سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے دیگر مسلم اقوام کو لازمی طور پر پیشہ ور علماء کے کسی نہ کسی سیاسی گروہ سے وابستہ ہونا پڑے گا، جو خود بھی عجمی ہونے کی بنا پر قرآن کریم کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس عربی قرآن کے مخاطب صرف اُس دور کے خاص لوگ ہی تھے، جس کی تصدیق حضرت ابن عباس کی اس وضاحت سے بھی ہو جاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا "ہم ہی وہ لوگ ہیں جن پر قرآن نازل ہوا پس ہم نے اس کو پڑھا اور اس کا مطلب بھی معلوم کر لیا کہ کس بارے میں وہ نازل ہوا اور عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر یہ نہیں جان سکیں گے کہ وہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوا تھا۔ تو وہ اس میں رائے زنی کرنے لگیں گے [5] " کیونکہ آپ کے نزدیک قرآن کریم صرف اُن لوگوں سے ہی مخاطب ہے جو اس کے خطاب کے موقع محل سے اچھی طرح واقف تھے۔

اسی سلسلے میں حضرت عمر نے عربوں کی نئی نسل کے لئے اپنے دین کو سمجھنے کے لئے دورِ جاہلیت کو سمجھنے کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں "جب مسلمانوں میں دورِ جاہلیت کو سمجھنے والے نہ رہیں گے تو اسلام کے اصول اور فروع کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی جائیں گی [6]۔

ہمارا زمانہ تو بہت دور کی بات ہے جبکہ ہم اہلِ عرب بھی نہیں ہیں، خود صحابہ کرام کے زمانے میں قرآن کے اسلوبِ تخاطب کو سمجھنا دشوار ہو چکا تھا جب مدینہ شہر اپنا پرانا فطری ماحول کھو چکا تھا، تو نئی نسل کے لئے قرآن اجنبی بن چکا تھا جس کی بنا پر حضرت عمر نے اہلِ مدینہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا "قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدووں میں جا کر کچھ دن گزارو کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہ زبان اُن کے ہاں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے [7]۔"

آنحضرت کی زبان بنی ہوازن کی ایک شاخ بنی سعد قبیلے کی زبان تھی، جس کی بنا پر آپ نے فرمایا تھا:

5- قرآن مجید کا نزول اور وحی، ص ۳۱۰
6- آثار التنزیل، ص ۱۶۰، از پروفیسر خالد محمود
7- ایضاً

"انا اعربکم و انا من قریش ولسان سعد بن بکر"

میں تم جیسا عرب ہوں اور قریش سے ہوں اور میری زبان سعد بن بکر (یعنی قبیلہ ہوازن) کے لب و لہجے پر ہے"

اس لئے قرآن کریم کی زبان پر پہلے قبیلہ بنی سعد کی زبان کے اثرات غالب تھے، جسے بعد میں حضرت عثمان کے زمانہ جمعِ قرآن کے وقت حضرت عثمان کے حکم سے کمیٹی کے افراد کافی حد تک قریش کے تلفّظ پر لے آئے تھے۔ اس سے قرآن کریم کا سبع قرأت پر تحریر کیا جانا ممنوع قرار پا گیا جس کا تعلق صرف قرآن کریم کی درست املاء سے تھا کیونکہ اُس وقت تک عربی تحریر کے اِعراب ایجاد نہیں ہوئے تھے اس سے املاء کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا، مگر فہم قرآن کا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے متنازع بنا ہوا ہے۔

فہم القرآن کا تمام تر تعلق ادب جاہلیہ سے تھا، عہد جاہلیہ اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر مسلمانوں کے طعن کا نشانہ تو ضرور بنا مگر ادبی اعتبار سے قرآن خود اُس عہد کا نقطہ عروج تھا اس لئے اس کی ادبی خصوصیات پر عہد جاہلیہ کی تمام تر خصوصیات کی چھاپ موجود تھی یعنی اپنے قبیلہ و خاندان پر فخر اور حسب و نسب کا پاس، فضائل اربعہ یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت کا دعویٰ اور صلہ رحمی جو قبیلے سے پوری عرب قومیت میں بدل گئی تھی۔

اگر اہلِ تشیع کے قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں آیات کے معنی میں ہر جگہ اہلبیت کے فضائل نظر آتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ "ایک چوتھائی قرآن اہلِ بیت سے متعلق نازل ہوا ہے[8]۔" چنانچہ اہلِ تشیع کے نزدیک قرآن کریم کی اکثر آیات کا مطلب اہلِ سنت سے مختلف ہے، اور قرآن کریم کا مقصدِ نزول تمام عربوں کو اہلبیت کی رعایا بنانا تھا۔

اگر ہم قرآن کریم پر صوفیائے کرام کے نقطہ نظر سے نگاہ ڈالیں تو حیرت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جیسا کہ مولانا رومی نے ایک بار قاری ضیاء الدین سے فرمایا تھا: "قرآن پاک میں چار چیزیں ہیں: عبادت، اشارت، لطائف اور حقائق" آپ فرماتے ہیں: "عبادت (کا تعلق) عوام سے ہے، اشارت کا خواص سے، لطائف کا اولیاء کرام سے اور حقائق انبیاء کرام کے سوا کوئی

8- دین حق، ص ۳۳، ترجمہ "المراجعات" از آقا عبدالحسین شرف الدین الموسوی العاملی (عراق) مطبوعہ لکھنؤ، ہندوستان

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

نہیں جان سکتا[9]۔" اس لئے اب قرآن کریم کے حقائق پر سے پردہ شاید قیامت تک نہ اُٹھ سکے کیونکہ حضرت ابراہیم کے دونوں بیٹوں کے سلسلوں (بلکہ تمام دنیا) سے اب نبوت ختم ہو چکی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی سورہ عنکبوت کی آیت:۴۳ "وما یعقلھا الاالعٰلمون" کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "حقائق قرآنیہ کا ادراک (عام لوگ) نہیں کرسکتے، مگر وہ لوگ جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے علم حق کے لئے کھول دیا ہے۔"

یہ وہی قرآن ہے جو کبھی اپنے زمانہ نزول میں تمام عرب امیّین پر نہایت سہل اور آسان ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑا عالم بھی اپنے عجز کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے اور کسی خاص تائید الٰہی کے بغیر اس کا سمجھنا محال سمجھتا ہے۔ اگر کسی لکھی ہوئی تحریر یا کتاب کو فقط کسی تائید الٰہی کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا تو پھر عوام میں اس کی موجودگی کے کیا معنی؟ اور علم حق سے مہجور لوگوں کے لئے اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ، خدا تو اس کے بغیر بھی، جس کی جب چاہے حق کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

بات نہایت صاف اور سیدھی تھی جسے لوگ جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، اگر آپ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں تو قرآن کے ہر قاری کو یہ بات صاف نظر آجائے گی کہ قرآن کریم دراصل بیشتر ایسے جوابات اور فیصلوں پر مبنی ہے جن کے سوالات اور پیش آمدہ مسائل تو اس میں درج نہیں مگر جواب اور فیصلے موجود ہیں جنہیں کتابی شکل دیتے وقت قرآنی فیصلوں کے ساتھ ان کی وجہ نزول یا شانِ نزول کو محفوظ رکھ کر قرآن کے حاشیہ پر لکھ دینے کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا گیا، شانِ نزول اگر محفوظ بھی ہے تو وہ قرآن سے الگ حدیث و تفاسیر کی ضخیم جلدوں میں ہیں جنہیں اب قرآن کا لازمی حصّہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی لئے اب اسے سمجھنے کے لئے عرب کے دور جاہلیہ، اُس معاشرے یا اُمّیوں کے حالات و مسائل کی چھان بین کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمیں آج اپنے زمانے کے قومی مسائل کی زیادہ فکر نہیں کرنی

9- حالات رومی، ص ۷۵، از محمد دین ایڈیٹر کشمیری میگزین

چاہئے؟ اور اگر ہم عرب اُمّیوں کے ڈیڑھ ہزار سال پرانے معاشرے اور ان کے حالات و مسائل کو سمجھ بھی لیں تو وہ آج ہمارے کس کام آئیں گے، اور کیا ہم آج سے ڈیڑھ ہزار سال پرانے مسائل یا ایک نیم متمدن عرب قوم کے مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے آج کے جدید مسائل کو بہتر طریقہ پر حل کر سکیں گے؟ اگر نہیں تو پھر ہم اس پر اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔

آج ہر ملک اور قوم کے اپنے اپنے الگ مسائل ہیں جن میں سے بیشتر مسائل کا عربوں کے لئے نازل ہونے والے قرآن میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ آج کے دور کے چند اہم مسئلے غربت اور عالمی معاشی ناہمواری ہیں جس کا کوئی معاشی حل اسلام کے پاس نہیں کیونکہ اسلام کا معاشی نظام خود جزیہ اور خراج کے لئے اپنے ہمسایہ ممالک کی زمینوں اور ان کے پیداواری وسائل پر قبضہ پر اُستوار ہوا تھا۔ جس کے ذکر کا یہاں یہ محل مناسب نہیں ہے[10]۔

اگر آج ہم قرآن کریم کو پڑھ کر اس کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو یہ محض ہمارے زمانے کے لوگوں کا ہی مقدر نہیں بلکہ اس میں وہ لوگ بھی ہمارے برابر کے شریک تھے جنہوں نے اسلام کا نہایت قریبی زمانہ نہیں پایا تھا حالانکہ وہ سرزمین عرب کے ہی باشندے تھے، مگر عرب امّی ہونے کا شرف انہیں حاصل نہیں تھا کہ قرآن کریم کی زبان کو وہ ویسے ہی سمجھ سکتے کہ جیسے صحابہ کرام کے بعد کسی قدر تابعین نے سمجھا تھا جیسا کہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا" اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن حکیم کا فہم نہ حاصل کر سکتا[11]۔" جبکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے با آسانی سمجھ میں آنے ہی کو عرب اُمّیوں پر حجت قرار دیا تھا۔

جناب غلام احمد پرویز (مدیر اعلیٰ طلوع اسلام) ایک جگہ فرماتے ہیں " قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور اپنے مطالب میں بڑا صاف، واضح اور آسان تھا۔ اس سے انسان عام طور پر اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جس شخص کو عربی زبان آتی ہو وہ قرآنی حقائق کو با آسانی سمجھ لے گا یعنی قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے صرف عربی زبان کا جاننا کافی ہو گا، یہ خیال صحیح نہیں دنیا میں کوئی کتاب بھی سمجھی نہیں جا سکتی جب تک انسان اُس زبان سے واقف نہ ہو جس میں وہ کتاب لکھی گئی

10- اس کے لئے دیکھئے "ابتدائی تاریخ اسلام کے چند اہم گمشدہ اوراق" مضمون، خلافتِ راشدہ میں اسلامی معیشت یا قومی آمدنی کا تصور

11- مقدمۃ المیزان، از اسلامی قانون نمبر، ص ۳۰۸، بحوالہ فقہ اسلامی، از مولانا محمد تقی امینی

ہے، لیکن اگر صرف عربی زبان جاننے سے قرآنی حقائق سمجھ میں آسکتے تو عرب جن کی مادری زبان عربی ہے قرآنی حقائق کے ماہر ہوتے، لیکن عرب کس حد تک قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عربوں سے مراد صرف ان کے عوام ہی نہیں، اس میں اُن کا پڑھا لکھا علماء کا طبقہ بھی شامل ہے۔ جب اس باب میں خود عربوں کی یہ حالت ہے تو غیر عربوں کے متعلق اندازہ کرنا مشکل نہیں۔" آپ فرماتے ہیں: "اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ 'وہ عربی زبان کی آسان کتاب ہے' اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف عربی جاننے والوں میں سے بلکہ خود اُن میں سے جن کی مادری زبان عربی ہے، بہت کم ہیں جو قرآنی تعلیم کو کما حقہٗ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ سوال بڑا بنیادی اور اہم ہے اور اس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے[12]۔

پرویز صاحب نے خود بھی اس اہم ترین سوال کا کوئی جواب تو نہیں دیا مگر آپ بے حد غور و فکر کے بعد صرف اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قرآن کریم کا ترجمہ تو بہر حال ممکن نہیں البتہ اس کے مفہوم کو ہی کسی دوسری زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور کسی ایسی کتاب کے متنازعہ مفہوم کو، جس کا تعلق خدا کی کتاب سے ہو، ادا کرنے میں جس قدر آزادی اپنے ذاتی خیالات، عقائد اور اپنی کم علمی کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنے کی مل جاتی ہے وہ ہم سب پر ظاہر ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی السابقون الاوّلون کے بعد ناقابلِ فہم بنا دیا تھا تو ہم کیوں اب دوسروں کو سمجھانے کے لئے کوشاں ہیں؟ جو خود بھی سمجھنا مشکل ہے۔ یہ کام اور ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہ اس کا کوئی بندوبست شروع میں ہی کر دیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا خود اس کی ضرورت کو صحابہ کرام کے بعد سے محسوس نہیں کر رہا تو ہم اس کے لئے کیوں فکر مند ہوں جن لوگوں کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا انہوں نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کیونکہ اُس وقت اس کا سمجھانا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری تھی جو اُس نے جس حد تک چاہی پوری کر دی تھی اور جنہیں سمجھانا مقصود نہیں تھا اُنہیں اس سے مہجور رکھا۔ کیا ہمیں اس

12- لغات القرآن، ص ۷، (پیش لفظ) نیز دیکھئے مطالب القرآن، ص ۳۲۰، از غلام احمد پرویز

میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نظر نہیں آتی؟ یاد رکھو کہ ہم خدا کے کاموں میں ہرگز دخل نہیں دے سکتے اور نہ کبھی اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں، جب تک خدا خود نہ چاہے۔

جناب غلام احمد حریری مؤلف "تاریخ تفسیر و مفسرین" فرماتے ہیں: "ترجمہ کی دو قسمیں ہیں: لفظی ترجمہ اور تفسیری ترجمہ۔ لفظی ترجمہ کے معنی ہیں کہ کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اسی نظم و ترتیب کے ساتھ منتقل کر دیا جائے، جیسے کہ وہ پہلے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصل کلام کے معنی و مفہوم کو بہر نوع قائم رکھا جائے اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔" آپ فرماتے ہیں "لفظی ترجمے کی (بھی) دو قسمیں ہیں، ترجمہ بالمثل اور ترجمہ بغیر المثل، ترجمہ بالمثل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کا کسی دوسری زبان میں ایسا ترجمہ کیا جائے جو ہر لحاظ سے اس کی مانند ہو۔ یہاں تک کہ ترجمہ کے مفردات قرآنی مفردات اور اس کا اسلوب و انداز قرآن کی جگہ لے لے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ قرآن کی اصل عبارت میں معانی جس بلاغی کیفیت سے متکیّف اور جن تشریعی مسائل پر حاوی ہوں وہ ترجمہ کے اندر بلا کم و کاست موجود ہوں" (گویا یہاں تک کہ وہ ترجمہ قرآنی متن کا اصل مترادف تسلیم کر لیا جائے) آپ فرماتے ہیں "قرآن کا لفظی ترجمہ قرآنی مقاصد کی تکمیل میں کسی طرح بھی اصل کی جگہ نہیں لے سکتا۔.... قرآن کریم کے ترجمہ بالمثل کو اگر ممکن فرض کر لیا جائے تو اُسے قرآن کی تفسیر نہیں کہہ سکتے[13]۔" یعنی پھر وہ ترجمہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن کریم کا ترجمہ بالمثل ہو گا جو محال ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا صرف اصل متن ہی صحابہ کرام کے زمانے میں اپنی عصری مناسبت سے خود اپنی مکمل تفسیر تھا۔ کیونکہ اُس وقت اس میں عصری تقاضوں کے تحت ناسخ و منسوخ کا عمل بھی جاری تھا جو اب ممکن نہیں رہا۔

جہاں تک قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیروں سے اُن قرآنی مقاصد کو حاصل کرنے کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے عرب میں اُس وقت حاصل کئے تھے تو اس بات کو خود اس کے مترجم و مفسر تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا محض ترجمہ یا تفسیر اب اُس دور کے مسلسل تنزیلی قرآن کا نعم البدل، دیگر اقوام کے لئے نہیں بن سکتے۔

13- تاریخ تفسیر و مفسرین، دیکھئے ص ۲۲ تا ۲۴

عربی قرآن کن کے لئے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کتٰبٌ فُصِّلتْ آیاتہ قرآناً عربیاً لِقومٍ یعلَمون" (حٰم السجدہ:۳) یہ کتاب ہے جو اپنے مضامین کھول کر بیان کرتی ہے، یہ عربی (زبان میں) قرآن ہے اُس قوم کے لئے جو (عربی) جانتی ہے۔

اگر یہ بات کسی کو نہ بھی بتائی جائے تب بھی ہر شخص قرآن کو دیکھ کر یہی کہے گا کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس قدر صاف اور کھلی ہوئی بات کے بارے میں بھی قرآن متعدد بار اس بات کو دہراتا ہے اور خاص طور پر اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ قرآن عربی زبان میں اتارا گیا ہے، تاکہ اے عرب قوم کے افراد تم اسے آسانی کے ساتھ سمجھ سکو، دیکھئے:

- ہم نے قرآن عربی اتارا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ (سورہ یوسف:۲)
- یہ کھلی عربی زبان میں ہے۔ (سورہ نحل:۱۰۳)
- کھول کر بیان کرنے والی (کتاب) عربی زبان میں۔ (سورہ شعراء:۱۹۵)
- اور اسی طرح ہم نے اسے نازل کیا قرآن عربی میں۔ (سورہ طٰہٰ:۱۱۳)
- قرآن عربی کجی سے مبرّا۔ (سورہ زمر:۲۸)
- اور اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا۔ (سورہ شوریٰ:۷)
- ہم نے اسے عربی قرآن بنایا تاکہ (اے عربی زبان بولنے والو) تم سمجھ سکو۔ (سورہ زخرف:۳)

ان تمام آیات میں قرآن کے عربی زبان میں ہونے کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں عربوں کو اس طرف کوئی خاص توجہ دلائی جارہی

ہے کہ اب تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے کہ تم کہہ سکو کسی عجمی زبان میں یا دوسروں پر اتاری ہوئی کتابیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ جو دراصل کسی دوسری قوم کے انبیاء پر بھی نہیں خود انہیں کی قوم کے انبیاء پر اتاری گئی تھیں، مگر زبان ان کی اپنی نہیں تھی۔ اسی لئے سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۳ میں تو یہ بات بالکل ہی صاف کر دی گئی کہ یہ صرف اُس قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے جو عربی زبان جانتی ہے۔ کیونکہ اس آیت میں "یعلمون" کا مادہ ع ل م ہے اور علم کا تعلق جاننے سے ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں جاننے یا علم رکھنے کا تعلق عربی زبان سے ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً تمام ہی مترجمین اور مفسرین اس کے صحیح معنی بتانے سے گریز کرتے ہیں اور عربی لفظ "یعلمون" کا ترجمہ عقل رکھنے والے عاقل اور سمجھدار لوگوں کی طرف پھیر دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ تاثّر دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ قرآن صرف عقل اور سمجھ رکھنے والوں کے لئے ہی قابل قبول ہے، نادان اور ناسمجھ لوگ ہی اس کا کھلا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں عام شخص یا کسی عاقل و دانشور کی کوئی تخصیص نہیں تھی بلکہ اس کا پیغام اولاد ابراہیم کے ہر فرد خاص و عام کے لئے تھا، جو ہجرت کے کچھ عرصہ کے بعد بالجبر صرف بنی اسمٰعیل کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، وہ بھی جو جزیرۃ العرب میں عزت کے ساتھ مقیم رہنا چاہتے ہوں، ورنہ اُنہیں قتل کر دینے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو مل چکا تھا۔

ہمارے تقریباً تمام ہی مترجمین یہاں یعلمون کا ترجمہ یعقلون سے بدل دیتے ہیں، حالانکہ یعقلون کا مادہ ع ق ل ہے، اور عقل کا تعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ سمجھ بوجھ یعنی فہم و فراست، تمیز اور دانائی سے ہے۔ جو قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ایک کھلی تحریف معنوی ہے۔ دوسرے قرآن کریم میں لفظ لِقومٍ یعلَمُونَ آیا ہے اور عاقل فرد ہوتا ہے پوری قوم نہیں۔ اس لئے یہاں باعتبارِ ضمیر جاننے کا تعلق عقل سے نہیں عربی زبان سے ہے اور یہ صرف اسی طرف راجع ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اسی یعلمون کا استعمال کس قدر صاف سمجھ میں آتا ہے جہاں فرمایا "قُل ھَل یستوِی الّذین یعلمُونَ والّذِینَ لا یعلمُون (سورہ الزمر:۹) کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ اگر ہم غلطی پر نہیں اور دیئے ہوئے

معانی کو درست سمجھ لیں تو سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۳، کا سلیس ترجمہ یوں ہو گا "اس کتاب کی آیتیں نہایت صاف اور سہل بنادی گئی ہیں مگر صرف اُسی قوم کے لئے کہ جن کی مادری زبان عربی ہے اس لئے کہ یہ عربی رائج میں نازل کیا گیا ہے "یسّرنا القرآن" یہ اُسی وقت کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ عام فہم، صاف اور با آسانی سب کی سمجھ آجائے، نہ کہ صرف عاقلوں کی۔ میں سمجھتا ہوں آج اس کا اِن تمام شرائط کے ساتھ سمجھنا جدید اہلِ زبان کے لئے بھی اس قدر آسان نہیں رہا کہ جس طرح کبھی عام عرب اُمّی بغیر کسی دقّت کے یوں ہی سمجھ لیا کرتے تھے۔ کیونکہ اُس زمانے میں اس کا آسان ہونا ہی اس کے اصل مخاطبوں کے لئے دلیل اور حجّت قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ سورہ مریم:۱۹ میں فرمایا "فانّما یسّرنہ بلسانِکَ" بالتخصیص ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کیا" کیونکہ یہاں "إنّما" تخصیص حصر کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہم "بِلسَانِکَ" کا اطلاق کیونکر تمام غیر عربی بولنے والی اقوام پر کر سکتے ہیں؟ اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ قرآن صرف اپنے طرز کی عربی بولنے اور سمجھنے والوں کے لئے ہی آسان بنا کر نازل کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ عام فہم، آسان اور فصیح و بلیغ رہا اپنے معیار کی عربی سمجھنے اور بولنے والوں پر دلیل بنا رہا، اس کے بعد آپ اسے سمجھانے کے لئے خواہ کتنی ہی تفسیریں لکھتے جائیں یہ ہر گز کسی پر آسان اور عام فہم نہیں بنایا جا سکتا۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ کیا قرآن کریم نے کبھی یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ میں غیر عرب دنیا کی طرف بھی اسی طرح آسان بنا کر بھیجا گیا ہوں جس طرح کہ اہلِ عرب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اس بات کے سمجھنے کا تعلق اُس دور کے عربی طرز اسلوب سے ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور کے عربوں کا یہ ایک عام قاعدہ رہا ہے وہ اِس آباد دنیا کو ہمیشہ دو حصّوں میں ہی تقسیم کرتے رہے ہیں، ایک عرب دنیا اور دوسری عجم۔ اس لئے انہیں جب کبھی بھی غیر عرب دنیا کا ذکر مقصود ہوا تو وہ اُسے عجم کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے، جیسا کہ جناب اشرف علی بہاری لکھتے ہیں:

"چنانچہ یہ اصطلاح یاد رکھنی چاہئے کہ عربی کے سوا کُل زبانوں کو عجمی کہا جاتا ہے، خواہ عبرانی ہو یا سریانی، انگریزی ہو یا جرمن، ماسوا

عربی کے جو زبانیں ہیں وہ سب عجمی ہیں" (المبین، ص ۱۶۸)

عربی رواج کے مطابق اب اگر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا مقصود ہوتا کہ یہ پیغام تمام دنیا کی ہدایت کے لئے یکساں نازل کیا جارہا ہے تو اس کی روشنی میں یہ مفہوم قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے ہر گز ادا نہیں ہوتا، جن میں "جمیعاً (۷:۱۵۸) النّاس یا کافّۃً (۳۴:۲۸) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ کہنا ضروری تھا کہ "یہ عربی زبان میں نازل ہونے والا قرآن عرب و عجم کی سب قوموں کے لئے ہدایت و نور ہے" یا پھر اس بات کو یوں بیان کیا جاتا کہ یہ قرآن اگرچہ سرزمینِ عرب میں عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے مگر یہ موجودہ اور آئندہ آنے والی تمام عربی اور عجمی قوموں کے لئے خدا کی طرف سے آخری حکم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو کتاب المبین میں ایسی کوئی بات کہنی ہوتی تو یقیناً اس طرح وضاحت سے کہی جاتی کہ کتاب المبین کا یہی تقاضہ ہے جس کے بعد کسی کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہتا۔ نعوذ باللہ یہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مشورہ نہیں دیا ہے بلکہ قرآن کریم پر سے اُس الزام کو دور کیا گیا ہے جو اس پر نزول کے بند ہو جانے کے بعد عجمیوں کے ترجموں اور تفسیروں کے ذریعہ اس سے منسوب کیا گیا ہے جسے قرآن کے معنوں میں تحریف ہی کہا جاسکتا ہے جو ایک جسارت ہے جو بات قرآن کریم نے خود کبھی نہیں کہی اور جس کی وجہ سے اس پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں ہم کہیں بھی عجمیوں کو دعوت دیئے جانے کا ذکر نہیں پاتے۔ اس لئے بھی کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی اپنی سنت کے خلاف بھی تھی۔

روح را بارِ گراں آئین غیر
گرچہ آید ز آسماں آئین غیر

اقبالؔ

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں عربوں کو کسی عجمی کا بارِ احسان لینے پر مجبور نہیں کیا یا کسی غیر قوم کی طرف سے پیش کردہ تعلیمات کا مکلف نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو اہلِ عرب کو خود انہی کے بھائی بندوں یعنی بنی اسرائیل کا بھی اس سلسلے میں احسان مند نہیں ہونے دیا ورنہ

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے تمام بنی اسمٰعیل کو تورات و انجیل کی بنا پر اہلِ کتاب میں شامل ہونا پڑتا اور امّی نہ کہلاتے۔(امّی کے ایک معنی غیر اہل کتاب کے بھی ہیں) ۔

تراشش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
اگر از دستِ تو کارِ نادر آید!
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبالؔ

یعنی تم خود اپنی ہی کدال یا پھاوڑے سے اپنا راستہ بناؤ کیونکہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا کسی عذاب سے کم نہیں، اگر تم اپنے ہاتھوں سے اپنی راہ بنانے پر قادر نہ ہو سکو، اور اس میں تم سے کوئی خطا بھی ہو جائے تو ایسے گناہ کو بھی ثواب ہی سمجھو یعنی آزادی کے ساتھ کانٹوں پر چلنا اس سے بہتر کہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر اپنی نظریں جھکا کر چلو۔

Jurat-e-Tehqiq

بنی اسمٰعیل کیوں اہلِ کتاب نہیں کہلائے

حضرت ابراہیم کے ساتھ آپ کے پورے خاندان کو نبوت وہدایت بخشی گئی تھی، اس لئے اصولاً حضرت ابراہیم کی تمام اولاد اہلِ کتاب سمجھی جانی چاہئے تھی جس میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی شامل تھی۔ اگرچہ لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نازل ہونے کے بعد سے ہی کیا جاتا ہے۔ دوسرے بقول مفسرینِ قرآن حضرت ابراہیم کو تمام دنیا کا امام بنایا تھا پھر آپ کی اپنی اولاد کیونکر اس سے مبرّا ہو سکتی تھی؟ اس لئے اصولاً آپ کی تمام اولاد اہلِ کتاب کے زمرہ میں آنی چاہئے جیسا کہ دین حنیف کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود آنحضرت نے بنی اسمٰعیل کو اہلِ کتاب میں شمار نہیں کیا، حالانکہ آپ خود ذاتی وحی کی غیر موجودگی میں شریعت تورات پر عمل پیرا رہے اور بنی اسمٰعیل بھی نظریاتی طور پر اسی شریعت سے منسلک رہے۔ مگر ذہنی طور پر نہ تو بنی اسمٰعیل نے خود کو اہلِ کتاب سمجھا اور نہ ہی بنی اسرائیل نے انہیں اہلِ کتاب تسلیم کیا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی جو آنحضرت کی نبوت کو بنی اسرائیل نے قبول نہیں کیا اس لئے کہ آنحضرت کا تعلق بنی اسمٰعیل سے تھا، جبکہ نبوت کا دائرہ عمل ہمیشہ خاندان اور قبیلے تک ہی محدود مانا جاتا تھا۔ مگر آنحضرت پہلے اور آخری نبی تھے جنہوں نے تمام ذرّیتِ ابراہیم کو ایک خاندان میں سمونے کی کوشش کی اور بنی اسرائیل کو بھی اپنے ہی خاندان میں شمار کر لیا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے قبول نہ کیا اگرچہ انہوں آپ کی نبوت کو جھوٹا بھی نہیں کہا مگر دستور کے مطابق آپ کی نبوت کو صرف بنی اسمٰعیل کے لئے مخصوص سمجھا۔ چنانچہ نبی کریم نے اپنی اس ناکامی کو تسلیم بھی کیا اور فرمایا کہ "اگر دس یہودی بھی مجھ پر ایمان لے آتے تو سارے یہودی مجھ پر ایمان لے آتے[1]" جبکہ اہلِ کتاب کو آپ پر ایمان لانے پر دُگنا ثواب بھی دیا جارہا

1- تجرید بخاری حصّہ دوم ص ۲۰۷، باب ہجرت الی المدینہ

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

تھا جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا "تین شخص جن کے لئے دُگنا ثواب ہے (ان میں سے ایک) وہ شخص ہے جو اہلِ کتاب میں سے ہو (اور) اپنے نبی پر ایمان لایا ہو اور محمد پر بھی ایمان لائے[2]" پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے قرآن کریم کی تبلیغ کا تقریباً نصف حصّہ صرف اہلِ کتاب کے لئے وقف کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی عرب کے یہودیوں کے دلوں میں بلاغتِ قرآن نہ اُتر سکی جو اُس دور کی عربی زبان سے بھی خوب اچھی طرح واقف تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جن جن لوگوں کی طرف آپ ﷺ کو مبعوث کیا تھا اُن کی نشان دہی قرآن کریم میں خود ہی کر دی تھی، مثلاً:

- سورۃ یٰسین:٦ میں فرمایا: (اے محمد) تاکہ تو اُس قوم کو ڈرائے جن کے باپ دادا (پہلے) نہیں ڈرائے گئے۔
- سورۃ السجدہ:٣ میں فرمایا: تاکہ تم اُس قوم کو ڈراؤ جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں۔
- سورہ الشوریٰ:٧ میں فرمایا: قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہلِ مکہ کو اور اُنہیں جو اس کے ارد گرد (آباد) ہیں۔

ان سب آیات سے مراد اہلِ عرب ہی ہیں کہ یہ لوگ حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے تھے اور ان کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے کوئی نبی یا ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا گیا: "وما آتينٰهُم مِن كُتُبٍ يدرسُونها و ما ارسلنا اليهم قبلك من نذير (سبا:٤٤) ترجمہ: اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے پڑھاتے اور نہ ہی تم سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا گیا۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی یہ ایک سنت رہی ہے کہ "وَلِكُلِّ قومٍ هاد" اگر بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل ایک ہی قوم ہوتی تو ان دونوں کے لئے بوجہ ایک قوم ہونے کے پہلے نازل ہونے والی کتابیں ہی کافی ہوتیں۔ مگر اُن کتابوں کے ساتھ ایک مشکل اور بھی تھی اور وہ یہ کہ ایک تو اُن کتابوں میں انہیں مخاطب ہی نہیں کیا گیا تھا اور دوسرے اُن کتابوں کی زبان بھی ان کی سمجھ میں

2- بخاری، کتاب العلم، باب ٣٧ حدیث نمبر ٩٦

نہیں آتی تھی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے محسوس بھی کر لیا تھا۔ اسی لیے قرآن کریم میں بار بار فرمایا" لو اب یہ عربی زبان میں براہ راست "علیکُم" اور "اِلیکُم" یعنی تم پر اور تمہاری طرف نازل کیا جا رہا ہے۔" نیز اگر بنی اسمٰعیل کا شمار اہلِ کتاب میں ہوتا تو احکام الصیام کے سلسلے میں اولادِ اسمٰعیل سے یہ نہ کہا جاتا کہ " تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے "(البقرہ:۱۸۳) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولادِ اسمٰعیل پر پہلی بار روزے فرض کئے گئے تھے۔ جبکہ دوسری تمام اہلِ کتاب قوموں پر پہلے ہی فرض کئے جا چکے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بنی اسمٰعیل کے سوا تمام قومیں پہلے سے اہلِ کتاب تھیں، مگر قرآن کریم صرف سلسلۂ ابراہیم کے اہلِ کتاب سے ہی مخاطب ہوا تا کہ اولادِ اسمٰعیل بھی اہلِ کتاب کہلا سکے۔ کیونکہ انہیں تورات و انجیل کا اصولاً مکلّف نہیں بنایا گیا تھا۔

پھر ایک عجیب بات ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے جو شعائرِ دین حضرت اسمٰعیل یا بعد میں اولادِ اسمٰعیل کو سکھائے وہ اپنی دوسری اولاد یعنی حضرت اسحاق کو نہیں سکھائے اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مناسکِ حج، عید الاضحیٰ، قربانی، طوافِ کعبہ اور حج کی دوسری کوئی رسومات بھی بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر یا افراد نے ادا نہیں کیں۔ اس کی جگہ اُنہوں نے صدیوں سے اپنا تعلق کعبہ کے بجائے فلسطین اور اس کے دوسرے مقدس مقامات سے ہی وابستہ رکھا۔ اگر ان میں کوئی تغیر بعد میں ہو بھی جاتا تو کم از کم حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کو تو اُن پر عمل کرنا چاہئے تھا۔ پھر نہ ہی ان کے بعد ان کی اولاد میں سے کسی پیغمبر نے کعبہ کا حج ادا کیا (اگرچہ بعض نے اپنے طور پر ایسا سمجھ لیا) اور نہ اسے کوئی اہمیت دی، جو سنت ابراہیم کہلاتی ہیں دوسری طرف اولادِ اسمٰعیل نے بھی ہیکلِ سلیمانی کی زیارت، شعائرِ دین کے طور پر کبھی نہیں کی! یہ کیسا دینِ حنیف ہے کہ اُن کے دو بیٹوں اور ان کی اولادوں میں بھی یکساں رواج نہ پا سکا؟ یقیناً اس کی وجہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے بعد بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دو الگ الگ قومیں بن چکی تھیں اسی بنا پر بنی اسمٰعیل کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے یہ اندیشہ محسوس کیا تھا کہ کہیں یہ ایسا نہ کہہ بیٹھیں کہ "ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ پر تو ہدایت اُتری مگر ہم اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سے قاصر ہی رہے "(۶:۱۵۶) پھر اُن کتابوں کے لانے والوں پر "رسولاً منکم" کا اطلاق بھی نہیں ہوتا

تھا کیونکہ اُن سب کا تعلق بنی اسحاق سے تھا۔ اسی وجہ سے اُن کے انبیاء سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر ان میں سے بعض نے عیسائیت قبول بھی کی تھی تو اس میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمِ الٰہی کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ مشرقی اہلِ روما کے عیسائی مبلغین کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ جب ایک ہی خاندان یا ایک ہی جدِّ امجد کی اولاد خود کو الگ الگ قوموں یا گروہوں کے افراد سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کی کتابوں اور پیغمبروں کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہوں تو دوسری قوموں کو تو اس کا حق بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے جبکہ غیر عرب دنیا کی بیشتر آبادی کا تعلق ایک بالکل ہی دوسری نسل کے لوگوں یعنی آرین قوموں سے ہے جن میں سرے سے نبوت کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

اگرچہ آنحضرت کی بعثت سے پہلے خود اس سامی خانوادے میں بھی نبوت متروک سمجھی جانے لگی تھی مگر مشیّتِ الٰہی کے نزدیک شاید ان میں ابھی ایک آخری نبی کا آنا باقی تھا اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا "یا اھل الکتٰبِ قد جآءَکُم رسولُنا یُبیّن لکُم علیٰ فترۃٍ مّن الرُّسّلِ "(المآئدہ:۱۹) یہاں خانوادۂ ابراہیم سے اللہ تعالیٰ کا یاأھل الکتٰب کہہ کر پکارنا آخری بار تھا کہ سورہ مائدہ آپ پر نازل ہونے والی آخری سورتوں میں سے ۱۱۲ویں سورت ہے۔ جس میں فرمایا گیا "اے اہلِ کتاب یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آیا وہ رسولوں کے بند ہو جانے کے بعد تم پر (احکام الٰہی) صاف صاف بیان کرتا ہے کہ (کہیں) تم یہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی خوشخبری سنانے والا آیا اور نہ ڈرانے والا..... " دو رسولوں کے درمیانی وقفے کو زمانہ فترت کہتے ہیں یہ زمانہ حضرت عیسیٰ اور حضرت رسول کریم کے درمیان کا زمانہ ہے، جو صرف اولادِ ابراہیم کی صاحب شریعت قوم پر ہی گزرا، اس لئے اس آیت میں صرف اہلِ کتاب کو ہی مخاطب کیا گیا، یا أیّھا الناس یا یاأیُّھا الّذین اٰمنُوا کہہ کر دوسرے اہلِ عرب کو مخاطب نہیں کیا، جن میں تمام بنی اسمٰعیل بھی شامل تھے۔ اور یہی قرآن کریم کے ہمیشہ مخاطب بہ خاص لوگ ہونے کا ثبوت ہے۔

دینِ اسلام میں عرب قومیت کا عنصر

قوم یا قومیت کا لفظ ہمارے دانشوروں کے درمیان ہمیشہ متنازع رہا ہے اور سب سے زیادہ اس بات پر کہ قوم وطن سے بنتی ہے یا مذہب سے؟ میں یہاں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا، بلکہ دونوں کو تسلیم کرتے ہوئے پہلے قرآن کے مفہوم کی طرف آنا چاہتا ہوں اور پھر اپنے مفہوم کی طرف۔

قرآن کریم میں بے شمار جگہ لفظِ قوم انبیاء کرام کے مخاطبین کے لئے آیا ہے۔ مثلاً قومِ لوط، قومِ نوح، قومِ صالح، یا قومِ موسیٰ علیہ السلام۔ دوسرے یہ لفظ گروہ یا فریق کے معنوں میں بھی آیا ہے مثلاً ناسمجھ قوم، جہل سے کام لینے والی، یا سمجھ بوجھ سے کام لینے والی قوم۔ جس میں ضروری نہیں ہے کہ سو فیصد افراد کا رَویّہ ایک جیسا ہی ہو بلکہ مراد اکثریت کے رویہ سے ہے۔ جو اپنے کسی خاص فعل یا مجموعی کردار اور رویّے کے نتیجہ میں بنتی ہے۔ قرآن کریم میں قوم کا لفظ زیادہ تر اُن افراد سے منسوب ہے جو انبیاء کرام کے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ لیکن عام اصطلاح میں کسی خاص نسل کے افراد یا کسی مقام سے منسوب لوگوں کو بھی قوم کہا جاتا ہے۔ جیسے افریقی قوم، ہندوستانی قوم، قومِ عاد اور قومِ ثمود، یا چینی اور جاپانی قوم وغیرہ۔ جس میں مختلف مذاہب اور سیاسی نظریات رکھنے والے الگ الگ لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اس معنی میں مذہبی رشتہ ایسی کسی الگ الگ قوموں کو ایک قوم نہیں بنا سکتا۔ مثلاً بغیر کسی حوالے یا وضاحت کے اگر کہا جائے کہ انڈونیشین اور پاکستانی ایک قوم ہیں تو یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک اُسے یہ نہ کہا جائے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں یہ دونوں قومیں ایک ہیں۔ مگر آج کی دنیا میں تمام قومی معاملات کو مذہبی مفادات کی روشنی میں نہیں بلکہ ملکی مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر سوچا اور سمجھا جاتا ہے، مذہبی یا جذباتی لگاؤ کسی ملک کے اقتصادی یا معاشی مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مذہبی وحدت الگ چیز ہے اور سیاسی اور ملکی وحدت اپنے الگ معنی رکھتی ہے۔ کسی ایک ملک میں رہنے

والے ملکی اعتبار سے دو الگ مذہب کے ماننے والے تو ایک قوم کے افراد کہلا سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک کے صدر یا وزیر اعظم کے لئے کہا جاتا ہے کہ آج صدرِ مملکت یا ہمارے وزیر اعظم قوم سے خطاب کریں گے تو کیا مذہبی نقطہ نظر سے اُس اعلان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج صدرِ مملکت مسلمان ہونے کی حیثیت سے صرف ملک کے مسلمانوں سے ہی خطاب کریں گے؟ یہ وہی بحث ہے جس سے میں یہاں گریز کرنا چاہتا ہوں۔

مختصر یہ کہ قومیت کی کم سے کم تین قسمیں ہیں ایک مذہبی دوسری نسلی اور تیسری وطنی۔ اس طرح قوم مذہب سے بھی بن سکتی ہے چاہے ان کی نسل اور ان کے رہنے کے وطن الگ الگ ہی کیوں نہ ہوں، وطن سے بھی بن سکتی ہے چاہے ان کا مذہب اور ان کی نسل الگ الگ ہی کیوں نہ ہو۔ اور نسل سے بھی بن سکتی ہے چاہے اُن کا وطن اور مذہب ایک نہ بھی ہو۔ یعنی نسلی قومیت، مذہبی قومیت اور وطنی قومیت۔ اِن سب میں قانونی تحفظ صرف وطنی قومیت کو ہی حاصل ہے خواہ ان کا مذہب اور ان کی نسل کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے، قومیت اور بین الاقوامیت، از جناب محمد قاسم حسن۔ مکتبہ جامعہ، دہلی)

دراصل یہاں میری مراد صرف ایک خاص نسل کے اُن لوگوں سے ہے جن کا تعلق اپنے اجداد کے قدیم مذہب کے حوالے سے نسلی قومیت یا قومی جدوجہد کے ذکر سے ہے۔ جن کا خیال تھا کہ ان کے مذہبی افتراق وانحراف نے ان کی سیاسی قوّت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔

اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کا مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام شروع سے ہی عرب کی ایک سیاسی قوت بننا چاہتا تھا جس کے لئے زیادہ سے زیادہ قومی اتحاد کی ضرورت تھی۔ زمانہ جاہلیت میں سارا عرب چھوٹی چھوٹی قبائلی یعنی سرداری حکومتوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کی مسلسل اور پیہم جدّوجہد سے بالآخر ایک دن پوری عرب قوم کے خیالات ایک مقصدِ عظیم کے حصول پر قریش کی زیر قیادت آنے پر مجبور ہوگئے جس کی تاخیر میں خود قریش کی اندرونی سیاست ایک عرصہ تک مُزاحم بنی رہی۔ دراصل اندرونی طور پر قبیلہ قریش کے دیگر خاندانوں کے نقطہ نظر سے بنوہاشم کی سیاسی برتری کو تسلیم کرنے میں مزاحمت اس تاخیر کی وجہ بنی رہی اور عرب کے نقطہ نظر سے دیگر قبائل عرب کے لئے قبیلہ قریش کی سیاسی برتری کو

تسلیم کرنا اس تاخیر کی وجہ بنی۔

عرب میں بادشاہت کا رواج نہ تھا اس لئے ہر قبیلے کا سردار ہی اپنے اپنے خاندان کا بادشاہ اور نمائندہ ہوا کرتا تھا، یوں عرب میں بے شمار چھوٹی چھوٹی قبائلی حکومتیں قائم تھیں۔ جب تمام عرب قبائل مدینہ میں قائم اسلامی حکومت کے سیاسی دباؤ کے تحت رفتہ رفتہ مسلمان یا اس کے مُعاہد ہو گئے تو یہ بات اب اس امکان سے خارج تھی کہ ملکی معاملات میں عرب سرداران آنحضرت کے کسی حکم سے سرتابی کریں، اس طرح آنحضرت کو جب عرب کے تمام سرداروں پر مکمل حاکمیت حاصل ہو گئی تو پورا ملکِ عرب حکومتِ مدینہ کی زیر نگرانی آ گیا۔ اس تمام عمل میں دینِ اسلام نے جس کی اصل بنیاد اپنے آبائی مذہب کی تجدید اور عرب قومیت کا اتحاد تھی مختلف قبائلِ عرب کے درمیان ایک ایسے واسطے (medium) کا کام دیا جس سے عرب قبائلیت کے منتشر اجزا باہم جڑ کر عزم وہمّت کا ایک کوہ گراں بن گئے، جنہوں نے پھر ایک عظیم قوت بن کر اپنے ارد گرد کی دنیا کو اپنی حاکمانہ عاطفت میں لے کر ہی دم لیا، چنانچہ اہلِ عرب کے حق میں دینِ اسلام نے آگے چل کر کلیدِ دنیا کا کام دیا۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

جس کے لئے آنحضرت عرب سردارانِ قوم سے فرمایا کرتے تھے:

میں تم کو اللہ کی جانب سے دنیا میں کسی حصّہ کا مالک بنا سکتا ہوں نہ آخرت سے کوئی بہرہ دلا سکتا ہوں۔ بجز اس کے کہ تم لا الٰہ الا اللہ" کہو[1]۔

یعنی تمہارے "لا الٰہ الا اللہ" کہنے پر میں تمہیں دنیا اور آخرت دونوں سے بہرہ مند کرا سکتا ہوں۔ نیز آپ نے فرمایا:

تم میری تبلیغ کی تائید کرو اس پر دین ہی نہیں دنیا میں بھی بہت جلد قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج تمہارے قدموں میں آ گریں گے[2]۔

آپ یہ نوید صرف اپنی قوم کو ہی دے سکتے تھے، تمام نوع انساں کو نہیں۔ دنیا کی تمام

1- طبقات ابن سعد، حصّہ اوّل، ص ۱۱۱۔ ۱۱۲

2- رسول کریم کی سیاسی زندگی، ص ۱۰۴، از ڈاکٹر حمید اللہ

قوموں کو کبھی ایسی نوید دی ہی نہیں جاسکتی تھی، خصوصاً اہلِ عجم کو کیونکہ اگر یہ نوید عالمگیر ہوتی تو آپ غیر قوموں کو بھجوائے گئے تبلیغی دعوت ناموں میں بھی اس کا ذکر ضرور فرماتے، جو کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جن خزانوں اور تخت و تاج کا یہاں ذکر ہے وہ تو خود پہلے سے ان کے مالک تھے۔ اس لئے آپ کے اندرونِ ملک کئے گئے تمام خطابات صرف اپنی عرب قوم سے ہی تھے۔ کیونکہ اُس وقت عربوں کو درپیش معاشی مسائل کا حل اپنے آبائی دین کے اس پرچم تلے متحد ہونے کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ تحریک اسلام کے پس پردہ یہی ایک مقصد تھا جسے عملی جامہ پہنانے کے لئے جدوجہد کی جارہی تھی۔ چنانچہ بیعت عقبہ (کبیرہ) کے موقعہ پر ایک انصاری نے اپنی قوم پر یہ واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اے گروہ خزرج! کیا تمہیں خبر ہے کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو، تم اِن سے عرب و عجم کی جنگ پر بیعت کر رہے ہو، خوب سمجھ لو[3]۔

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، عملی جدوجہد کا نام جہاد فی سبیل اللہ رکھا گیا۔ جس کے دو مرحلے تھے، ایک اندرونِ ملک اس مقصد کو حاصل کرنے سے پہلے عرب اتحاد کے لئے راہ ہموار کرنا، جس کے لئے پہلے عرب کی تمام آبادی کی درجہ بندی کی گئی جس میں اوّل قریش، دوم تمام بنی اسمٰعیل کے قبائل اور پھر غیر عربوں کے لئے پالیسی مرتب کی گئی، عرب میں مقیم غیر عربوں کے لئے یہ پالیسی بنائی گئی کہ اگر وہ اسلام قبول کر کے ہمارے ساتھ عرب اتحاد میں شامل ہونا چاہیں تو اُنہیں اس کی اجازت ہو گی، نہ ان پر کوئی زبردستی کی جائے نہ کوئی خصوصی تبلیغ۔ یہ لوگ عموماً ان عربوں کے غلام ہی ہوا کرتے تھے جو عرب معاشرے میں اپنے آقا سے منسوب ہونے کے باعث اسی قبیلے کے افراد، اور عرب قومیت کا ہی حصّہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انہیں نہ تو کبھی اسلام قبول کرنے کی کوئی ترغیب دلائی جاتی تھی اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا کوئی جبر تھا دوسرے نمبر پر وہ عرب قبائل تھے جنہوں نے عیسائیت یا یہودیت قبول کی ہوئی تھی۔ اُنہیں حتی الامکان مسلمان بنانے کی کوشش کی گئی، ان میں سے جو اس پر راضی نہ ہوئے تو شروع میں تو انہیں اپنے جزیہ گزاروں میں شامل کرنا پسند کر لیا گیا لیکن جب اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی تو ان کے لئے پہلی پالیسی بدل دی گئی اور انہیں باعزت طور پر جلاوطن کر دیا گیا۔

3- سیر انصار، حصّہ اوّل، ص ۸۱ تا ۸۴، از مولوی سعید انصاری، مطبوعہ اعظم گڑھ، بحوالہ سیرت ابن ہشام، ص ۲۴۲۔ ۲۴۴

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

یہودیت قبول کرنے والے بہت کم لوگ تھے ، باقی جو تھے وہ بیشتر اہلِ انصار سے تعلق رکھتے تھے جنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اندرونِ ملک قریش چونکہ سرِ فہرست تھے اس لئے ان پر خصوصی توجہ دی گئی، کیونکہ بعد میں اسلامی سلطنت کے قیام اور اسے چلانے کا تمام تر کام اِنہیں کے کاندھوں پر ڈالا جانے والا تھا۔ دوسرے یہ تحریک بھی اسی قبیلے سے اُٹھی تھی اس لئے یہی اس کے صحیح حقدار بھی تھے ،یہی وجہ تھی جو قریش کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اِنہیں ایک خاص حد تک ہی دبایا اور ستایا جاتا تھا۔

جب باقی عربوں پر اسلام کے معاملے میں سختیاں کی جانے لگیں تو ان کی نظریں بھی قریش کی طرف اُٹھنے لگیں کیونکہ وہ سب صرف انہیں کو مسلمانوں کا صحیح مدِ مقابل سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے ایمان لانے کے معاملہ کو قریش کے ایمان لانے پر موخّر کر رکھا تھا، یوں تمام تر دارومدار قریشِ مکہ کے ایمان لانے یا ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو جانے پر تھا۔ چنانچہ جب قریش مسلمانوں کے ہاتھوں باعزت مغلوب ہوگئے اور انہیں فاتحین نے بغیر اقرارِ توحید خود ہی مسلمانوں کے زمرہ میں شمار کر لیا یعنی طُلقاء (صلہ رحمی کے تحت آزاد اور بریُ الذمّہ) سمجھ لیا جس سے قریش کی قوت ختم ہونے کے بجائے اور بھی محفوظ ہو گئی۔ اس کے بعد بعض کے سوا (بنی ثقیف و ہوازن) تمام عرب قبائل نے اپنی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے بادِل ناخواستہ مسلمان ہونے میں ہی اپنی خیر سمجھی۔

حکومت مدینہ کے لئے اب دوسرا مرحلہ بیرونِ عرب "الجہاد" کے ذریعہ قیصر و کسریٰ سے اُس علاقے کو خالی کرانا تھا جہاں ان حکومتوں نے اسے لاوارث سمجھ کر اپنا اپنا تسلّط جمایا ہوا تھا جو عرب سے ملحق بھی تھا اور عرب کے لئے اپنے آئندہ دفاع کے نقطہ نظر سے اہم بھی۔ خوش قسمتی سے وہاں کی بیشتر آبادی پہلے سے ہی عربوں پر مشتمل تھی اُنہیں عرب قومیت کی بنیاد پر اپنے ساتھ ملانا بہت آسان تھا جنہیں قیصر و کسریٰ کی حکومتیں کچھ رعایتیں دے کر اپنے مقاصد حاصل کیا کرتی تھیں۔ یعنی شام، عراقِ عجم اور عراقِ عرب کے علاقے جو اِن دونوں حکومتوں میں بٹے ہوئے تھے۔

جہاں تک ان علاقوں پر قبضے کے بعد دعوتِ دین ابراہیم کا تعلق تھا تو آنحضرت ﷺ نے

اس بارے میں پہلے ہی اپنی پالیسی کا اظہار فرمادیا تھا کہ آپ صرف سرزمینِ عرب کو ہی غیر ادیان سے پاک کرنے کے لئے دنیا میں تشریف لائے ہیں کیونکہ بالجبر دین حنیف پر دوبارہ عمل پیرا کرانا جزیرۃ العرب کے بنی اسمٰعیل تک ہی محدود رکھا گیا تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا:

"اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب"

"یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو"

سرزمین عرب کو کفر سے پاک کر دینے سے آپ کا تبلیغی عمل پورا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ سرزمینِ عرب میں "لا اکراہ فی الدین" کی آزادی سے یہ مقصد ہر گز پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ باقی دنیا کی طرح عرب میں بھی جزیہ کا نظام رائج ہو جانے پر سرزمین عرب میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بجا نہیں لایا جا سکتا تھا جس میں رسول کریم نے فرمایا تھا کہ "وأمرتُ أن أُقاتِل الناسَ[4]" یعنی "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دیں، پس جب ایسا کرنے لگیں تو مجھ سے اپنے خون اور مال بچالیں گے" (ابن عمر سے مروی حدیث شریف) جزیہ اس بات کی اجازت دے دیتا ہے کہ جزیہ دینے والا جو دین چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اگر یہ حکم تمام دنیا کے لئے ہوتا تو پھر جزیہ کا نظام کہیں بھی رائج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس حدیث کی روشنی میں آپ پر اور آپ کے بعد خلافت راشدہ پر عرب کی طرح غیر عرب دنیا میں بھی جبری تبلیغ فرض ہو جاتی۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ عرب کی طرح غیر عرب دنیا میں کہیں بھی اشاعت دین کا کام نہیں ہوا اور جزیہ کے سوا جبراً ایمان لانے پر مجبور بھی نہ کیا گیا۔

تقابل ادیان کی مشہور و معروف محققہ کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں کہ:

> "حضرت محمد کے اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک اسلامی سلطنت اس پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ آٹھویں صدی کے وسط تک دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو قبول اسلام کی ترغیب نہیں دی جاتی تھی۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اسلام عربوں یعنی حضرت ابراہیم کے فرزند حضرت

4- تجرید بخاری، کتاب الایمان، حصّہ اوّل ص ۱۹ (۱۷/۲۴)

اسماعیل کی آل اولاد اور یہودیت بنی اسرائیل یعنی حضرت اسحٰق کا دین اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب کی آل اولاد کا مذہب ہے اور عیسائیت انجیل مقدس کے ماننے والوں کا دین ہے۔ آج کے دور میں بعض مسلمان یہودیت اور دین عیسوی کو برا بھلا کہتے ہیں اور بعض انتہاء پسند ساری دنیا کو اسلام کا پرچم لے کر فتح کرنا ایک مقدس فریضہ خیال کرتے ہیں لیکن انہیں محض ان اختراعات سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے جو صدیوں کی مقدس روایات سے ناطہ توڑ کر کسی اور ہی سمت کو ہو چلی تھی"۔(تہذیبوں کی کایا کلپ ص:۵۳۴)

جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں "حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ سلاطینِ روم و عجم کے خلاف فوج کشی سے پہلے اُن ممالک میں صحابہ کرام کو عام تبلیغی مہمات پر روانہ کیا گیا ہو، اور پھر اُس دعوت و تبلیغ کے نتائج کا(عرب کی طرح)انتظار کیا گیا ہو[5]۔" خود نبی کریم نے بھی صرف سلاطینِ عجم کو ہی تبلیغی حکم نامے ارسال کرنے پر اکتفا فرمایا، اس کے ساتھ آپ نے ان کی عوام کے لئے ضروری نہیں سمجھا کہ براہ راست باشندگانِ روم، ایران اور مصر کو خطاب کریں اور اُن کے جواب کا انتظار فرمائیں۔ مرحوم مولانا مودودی صاحب اس کی وجہ اُن سلاطین کا اقتدار پر قابض ہونا بتاتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں "اُن کا برسرِ اقتدار ہونا ہی اشاعت اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا..... یہی وجہ ہے کہ اُن سلاطین کے نام اپنے مکتوباتِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "اگر تم یہ دعوت قبول نہ کروگے یا ہماری اطاعت تسلیم نہ کروگے تو اپنی رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہارے(ہی) سر ہوگا[6]۔"

ایک تو اس قسم کے سیاسی حکم ناموں کو تبلیغی دعوت ناموں کا نام دینا ہی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ان کا مطلب یہی نکالا جائے تو پھر اس بات کا جواب کون دے گا کہ "جب قیصر و کسریٰ کے وہی مقبوضہ علاقے خود عربوں کے اپنے قبضہ اقتدار میں آگئے تو انہوں نے وہاں تبلیغ و دعوت کا کیا اہتمام کیا؟ اور کیوں خود بھی وہی عمل کیا جو پہلے قیصر و کسریٰ کیا کرتے تھے، یعنی جزیہ

5- رسائل و مسائل، حصّہ چہارم، ص ۱۹۱

6- ایضاً

کے بدلے میں مذہبی آزادی۔ یہی رویّہ خلفائے راشدین نے بھی اختیار کیا۔ اس طرح جزیہ و خراج کے عوض اُن علاقوں کی عوام کی گمراہی کا وبال کس کی گردن پر رہا؟ اور یوں شرکیہ مذاہب اور عوام کی گمراہی کے سدّباب کیلئے قیصر و کسریٰ کی بادشاہت یا خلافتِ راشدہ کے قیام سے کونسی رکاوٹ دور ہوگئی؟ اس لئے ہمیں صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ دینِ حنیف یاملّۃ ابیکُم ابراھیم کا تعلق صرف جزیرۃ العرب کے عرب باشندوں تک ہی محدود تھا۔

اگر جزیہ ادا کردینے سے شرک یابت پرستی اور دوسری اخلاقی برائیاں جائز ہوسکتی تھیں تو خود اہلِ عرب کے حق میں ایسی مذہبی رواداری اور لا اکراہ فی الدین پر کیوں عمل نہیں کیا گیا؟ اور کیوں تقریباً تیئس سال تک تبلیغ و دعوت کے ذریعہ نتائج کا انتظار کیا گیا اور انہیں اسلام کی ترغیب دلانے کے لئے مؤلفۃ القلوب کے نام سے ایک طویل مدت تک سوچنے کی مہلت اور مالی امداد بھی فراہم کی گئی۔ کیا عرب اور اہلِ قریش میں اس قسم کی امتیازی دعوت، اسلام میں عربی قومیت کالحاظ نہیں کہلائے گی؟

یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات کے دور میں ہمیں کوئی باقاعدہ سرکاری یا نجی ادارہ ایسا نظر نہیں آتا کہ جو غیر عربوں میں بھی اسی احساسِ ذمہ داری اور جذبہ ہمدردی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیتا جس طرح حدودِ عرب میں تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم اہلِ عجم کے لئے کوئی ایسا پیغام یا لائحہ عمل اپنے ساتھ نہیں لایا تھا جس میں کہ قریش یا اہلِ عرب کی طرح سالوں غور و فکر کی مہلت بھی ہو اور تالیف قلوب کی پیشکش بھی۔ اگر غیر قوموں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہوتا تو ہمیں اس کے آثار نبی کریم ﷺ کے مجموعی رویّہ اور خلافتِ راشدہ کے دور حکومت میں ضرور ملتے۔ اور اس حدیث نبوی کی رو سے عربوں کی طرح غیر عرب قوموں کا قتل بھی یہاں تک کیا جاتا کہ جب تک وہ سب بھی اس بات کی گواہی دینے پر مجبور نہ ہو جاتیں کہ حضرت ابراہیم کے خدا[7] کے سوا کوئی دوسرا معبود، معبودِ حقیقی نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں، اور نماز پڑھنے لگتے اور زکوٰۃ ادا کرنے لگتے، جس سے وہ اپنا مال اور اپنی جان محفوظ کرالیتے اور عربوں کی طرح اپنی مذہبی آزادی

7- دیکھئے، اس پر ایک الگ مضمون "من، اہرمن اور یزداں" (سامیوں کا خدا)

کے بدلے میں جزیہ و خراج کی ذلّت سے بھی بچ جاتے اور آخرت میں بھی خدا کی ان تمام نعمتوں کے حقدار بنتے جن کی بشارت عربوں کو دی گئی تھیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عربوں کے باطل اِلٰہ کے سوا کسی اور مذہب کے معبودوں کو کہیں بھی باطل اِلٰہ نہیں کہا بلکہ صابئین، یہود اور نصاریٰ کو اگر وہ اپنے دین پر صحیح طور پر کاربند ہوں اور ایک اللہ اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہوں تو اُنہیں ہر خوف و حُزن سے آزاد کیا ہے (۲:۶۲ و ۵:۶۹) اس کے علاوہ سورہ حج میں مجوسیوں کو بھی ساتھ ملا کر ان سب کے معاملات کو روزِ قیامت کے فیصلے پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ (۲۲:۱۷) جس کے بعد پھر دنیا میں اِن سے کوئی باز پُرس نہیں ہو سکتی تھی۔

اس میں بھی شک نہیں کہ عرب کے مسلمانوں نے اپنی مجوّزہ عرب سرحدوں سے باہر اپنے معاہدوں سے پہلے، حجت پوری کرنے کیلئے اکثر رسمی طور پر دعوتِ اسلام بھی دی۔ مگر اس دعوت اور اندرونِ عرب کی دعوت میں ایک نمایاں فرق تھا، جسے تاریخ اسلام کا ہر طالب علم بہت آسانی کے ساتھ محسوس کر سکتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی بھی قوم کے مذہبی عالم ہوں یا عوام، اُن کا اپنے معاشرے کے صدیوں پرانے رسم و رواج اور نظریہ حیات سے کتنا گہرا اور جذباتی تعلق ہوتا ہے اور اِن کی جڑیں کتنی مضبوط ہوتی ہیں جن کے مقابلہ میں کسی بالکل ہی نئے مذہب کو کسی دوسری قوم کے کامیاب محاصروں کے بل پر قبول کرنے یا ردّ کرنے کا فیصلہ ایک دم نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ تلواروں کے سائے میں غیر قوموں سے پوچھا جاتا تھا۔ اِن کے مقابلے میں اہلِ عرب کو جس دین کی دعوت دی جا رہی تھی وہ اُن کیلئے کوئی نیا دین نہیں تھا بلکہ وہ ان کا اپنا ہی آبائی دین تھا جسے قبول کرنے کے وہ سب "وَوَصّٰی بِھَآ اِبرٰھٖمُ بَنِیہِ.... (۲:۱۳۲) حضرت ابراہیم کی وصیّت کے مطابق پابند بنائے گئے تھے۔ اِنہی صاحبِ ایمان حضرات کے بارے میں جو قبلِ اسلام آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے الفت سے بھر دیا تھا فرمایا تھا "وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنتُم مُّسلِمُونَ (۳:۱۰۲) اور تم سب ہر گز نہ مرنا مگر (اس حال میں کہ) مسلمان رہو۔" جنہیں اپنے آبائی دین پر دوبارہ چلانے کے لئے تقریباً ایک چوتھائی صدی تک سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ بھی فراہم کیا گیا۔ اور اس دوران اگر ان کے ساتھ کوئی جھگڑا بھی ہوا تو صرف ایک بار مالِ غنیمت یا فدیہ دے کر جان چھڑانے کے سوا

نہ اُنہیں اپنا مستقل جزیہ گزار بنایا اور نہ ہی غیروں کی طرح ذمّی یا غلام بنایا گیا۔

کسی علاقے یا زمانے کا مذہب محض کوئی عقیدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک تہذیبی ورثہ، اور بادشاہوں اور وہاں کی بسنے والی قوموں کے لئے ایک سیاسی و قار بھی ہوتا ہے۔ اسلام اہلِ عرب کو جس دین کی دعوت دے رہا تھا وہ ان کے اپنے ہی ماضی کے تہذیبی اور تاریخی ورثہ کا حصّہ تھا، جبکہ دوسری قوموں سے اسلام قبول کرنے پر اُن کے ماضی کا یہ تمام قیمتی سرمایہ اُن سے چھِن رہا تھا۔ جس کی وجہ سے آج بعض غیر عرب مسلم قومیں خود اپنے اجداد کے کارناموں اور اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر کے، عربوں کے ماضی کو اپنا ماضی اوران کے بزرگوں کے کارناموں کو اپنے اجداد کے کارنامے سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم میں واضح طور پر کسی ایک جگہ بھی دعوت دین کے لئے اہلِ عجم کو براہ راست مخاطب نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ حاضرین عرب اور اُس وقت کے موجود اہلِ ایمان کو "یا ایّھا النّاس" اور " یاایّھا الذین امنوا" اور بنی اسرائیل کو" یابنی اسرائیل " کہہ کر واضح طور پر پکارا گیا تھا۔ اس کے باوجود اہلِ عرب نے دین اسلام کو قبول کرنے میں سالوں پس و پیش کی، مگر انہیں اس جرمِ تاخیر پر کوئی ذلت آمیز سزا نہیں دی گئی۔ مگر عرب سرحدوں سے باہر جو طریقہ اپنایا گیا اُس کی صورت دوسری تھی وہ یہ کہ حکمرانوں اور سالاروں کو انفرادی طور پر ایک عام دعوت دی گئی جس نے قبول کی اس کو پناہ دی اور اس کے حقوق مسلمانوں کے برابر رکھے گئے، مگر جنہوں نے اس عجلت میں دی گئی دعوت کو قبول نہیں کیا اُنہیں فوراً ہی محکومانہ عاجزی کے ساتھ یا تو جزیہ کی ذلت کو قبول کرنا پڑا یا پھر مسلمانوں کی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔

فتح مکہ سے قبل اندرون عرب بعض عرب قبائل سے ان کے کفر پر بھی باعزت معاہدے کئے گئے اور اُن سے جزیہ طلب نہیں کیا گیا، حدود عرب یا اس سے باہر عرب قبائل سے یا تو غیر جانبداری پر یا پھر مقامی تعاون پر معاہدے کئے گئے تھے۔ جیسا کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"عرب کی سرزمین کے بارے میں دوسری سرزمینوں سے مختلف حکم اس لئے قابلِ فہم ہے کہ اسی طرح عرب کے بت پرستوں کے بارے میں یہ حکم ہے کہ یا تو وہ اسلام لائیں یا قتل کر دئے جائیں۔ ان سے جزیہ نہیں قبول کیا جائے گا، یہ حکم اُس حکم

سے مختلف ہے جو اِن کے (علاوہ) دوسرے لوگوں کے بارے میں آیا ہے۔[8]"

اہلِ عرب کے بارے میں جو حکم ہے وہ اُس حکم سے مماثلت نہیں رکھتا جو (اہلِ) عجم کے بارے میں ہے، کیونکہ عجم والوں سے اسلام لانے یا جزیہ ادا کرنے کے مطالبہ کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے... عرب والوں سے صرف اسلام لانے کے مطالبہ کے ساتھ، یا تو یہ اسلام لائیں گے یا قتل کر دئے جائیں گے، ہمارے علم میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یا آپ کے صحابہ میں سے کسی نے یا آپ کے بعد خلفاء میں سے کسی نے عرب کے بت پرستوں سے کبھی جزیہ لیا ہو۔[9]"

فتح مکہ کے موقعہ پر مشرکینِ مکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب قریش مکہ کی شکست کے بعد ان کے اعلان اسلام سے قبل ہی اُنہیں جان و مال دونوں کی امان دے دی گئی تھی۔ جبکہ اس سے کچھ ہی پہلے یہودیوں سے ان کی ہزیمت کے بعد معاہدے کا بنیادی عنصر جزیہ قرار پایا تھا۔ قریش مکہ کو محض صلہ رحمی کی بنا پر نہ صرف معاف ہی کیا بلکہ ان کی تالیف قلوب کے لئے بعد کی جنگوں سے حاصل شدہ مال غنیمت سے بھی خصوصی حصّہ عطا کیا گیا۔ جو دوسرے عرب کے زورآور قبیلوں کے افراد سے حاصل ہوا تھا۔

یہ بھی کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ مہاجرین مکہ، مشرکین مکہ سے اپنی قرابت داری کی وجہ سے محبت و ہمدردی کے ساتھ پیش آئے ہوں۔ فتح مکہ سے پہلے جب اُن پر حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، جنہیں اہلِ مکہ سے انتہائی پوشیدہ رکھا جا رہا تھا، ایک غیر قریش مہاجر حضرت حاطب بن بلتعہ نے ایک خط کے ذریعہ جو کسی عورت کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اہلِ مکہ کو مسلمانوں کی جنگی تیاریوں سے مطلع کرانا چاہا تھا، جو قبل از وقت پکڑا گیا حالانکہ یہ ایک انتہائی سنگین جرم تھا لیکن حضرت حاطب جو جنگ بدر میں بھی شریک رہ چکے تھے، اپنی بے گناہی میں صرف ایک جملے سے بری ہو گئے تھے کہ "مجھ سے پہلے بھی تمام مہاجرین اپنے مکی اعزّہ و اقارب کی حمایت و مُساعدت کرتے رہے ہیں۔ میرا تو اُن سے کوئی نسبی تعلق بھی نہیں، میں نے تو صرف اُن کے اُن احسانوں کا

8- کتاب الخراج، ص ۲۴۰
9- کتاب الخراج، ص ۲۵۹، (اردو) عربی ص ۷۹

بدلہ چکانا چاہا تھا جو وہ میرے رشتہ داروں کے ساتھ کرتے رہے ہیں[10]۔" چنانچہ رسول اللہ نے محض ان کی اس صاف گوئی پر اُنہیں کوئی سزا نہیں دی کہ مہاجرین اور حکومتِ مدینہ کا اپنے مشرک عزیز و اقارب سے ہمدردی کا یہ جرم، عام اور پسندیدہ تھا۔

اس کا ایک ثبوت ہمیں حضرت عثمان غنی کی زبانی بھی ملتا ہے کہ جب آپ سے قرابت داروں کو فائدہ پہنچانے اور صلۂ رحمی کرنے کی شکایت کی گئی تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور اُنہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھا کہ (کیا) رسول اللہ قریش کو تمام عرب پر ترجیح نہیں دیتے تھے؟ اور کیا قریش میں بنو ہاشم کا سب سے زیادہ خیال نہیں رکھتے تھے؟ اس پر لوگ خاموش ہو گئے۔ (اس لئے کہ درمیان میں خدا کا واسطہ آ گیا تھا) پھر آپ نے فرمایا "اگر میرے ہاتھ میں جنت کی کنجی ہوتی تو میں تمام بنو اُمیّہ کو اس میں بھر دیتا[11]۔"

حضرت عثمان کی اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت قریش کو تمام عرب پر ترجیح دیتے تھے اور تمام قریش پر بنو ہاشم کو، جبکہ بنو ہاشم میں باصلاحیت لوگوں کی شدید کمی تھی۔

آنحضرت ﷺ نے عرب نسل کے لوگوں کے لئے جو پالیسی بنائی تھی، جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، اس میں اُنہیں بہر صورت مسلمان بنانا تھا۔ جن میں مکہ کے مشرکین سرِ فہرست تھے کہ یہی اس تحریک کا سب سے بڑا قومی اور سیاسی سرمایہ تھے۔ جسے مشرکینِ مکہ میں خصوصاً بنو امیّہ اپنی خاندانی عصبیت کے غرور میں فتح مکہ سے پہلے نہیں سمجھ سکے۔ جن کے لئے آنحضرت نے ہمیشہ اپنے خدا سے ان کی ناسمجھی اور معذوری کے لئے دعائیں مانگیں اور اُن کے لئے بڑی سے بڑی تکلیف کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور ان کے لئے درگزر کی ایسی مثالیں چھوڑیں جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ رسول کریم نے اس راہ میں جو تکالیف برداشت کیں اُن کی ایک ہلکی سی جھلک مولانا حالی نے اپنی مسدّس میں پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؏

وہ رسول ہاشمی، وہ رحمۃ للعالمین
پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مساء

10- بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ فتح
11- سیر الصحابہ، جلد اوّل، ص ۱۹۹، از شاہ معین الدین احمد، ندوی بحوالہ ابن سعد، جلد ۳ تذکرہ عثمان، ابن حنبل، جلد اوّل، ص ۶۲

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اُس کا سلوک
اُس طرف سے تھی جفا اور اِس طرف سے تھی دعا
کون سی تکلیف تھی جو قوم نے اُس کو نہ دی
پر کبھی چاہا نہ اُس نے قوم کا اپنی برا
جب احد میں ہو گیا دندانِ پاک اُس کا شہید
قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اِس کے سوا
کر ہدایت قوم کو یا رب کہ ہیں معذور یہ
اِن کی عقلوں پر ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا
قوم کے حملے رہے جب تک کہ اُس کی ذات پر
خندہ پیشانی سے سب اُن کے سہے جور و جفا

(جواہرات حالی، ص۵۸)

علامہ اقبال آپ کی ان تمام تکالیف کا مقصد اپنے ایک شعر میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؏

ماند شہبا چشمِ او محروم نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

ظاہر ہے آپ کی قوم وہی ہو گی جنہوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائیں اور جن کے لئے آپ کی آنکھیں راتوں کی نیند سے محروم رہیں یا جن کے لئے آپ نے دن رات دعائیں مانگیں۔ ایسی صورت میں تمام دنیا کے لوگ آپ ﷺ کی قوم کے افراد نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ نہ تو انہوں نے آپ کو عربوں کی طرح تکلیفیں پہنچائیں اور نہ ہی آپ نے عجمی قوموں کے لئے کبھی دعائیں مانگیں اور شب بیداری فرمائی اور نہ ہی پھر قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج، اور اُن قوموں کی دولت عربوں کے سوا کسی اور کے حصّہ میں آئی۔ رہی قیصر و کسریٰ کی عوام تو نہ ہی اُنہیں عربوں کی طرف سے کوئی عزت ملی نہ انسانی پیار۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمتہ للعالمین کا لقب عطا فرمایا ہے اور آپ ﷺ دانائے عرب و عجم تھے، جیسا کہ مولانا رومی نے فرمایا ؏

جملہ دانایاں ہمی گفتہ ہمی

ہست دانا رحمۃ للعالمین

اس لئے آپ کی دانائی اور رحمت سے حصّہ پانے کے لئے دوسری قوموں کو بھی آپ سے فیض حاصل کرنا چاہئے اور آپ کے نقشِ قدم پر چل کر آپ کی طرح اپنے وطن اور قوم سے اسی طرح محبت کرنی چاہئے جیسی کہ آپ ﷺ نے کی اور اپنی قوم کے لئے ایسی ہی تکلیفیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنی چاہئیں جیسی کہ آپ نے برداشت کیں اور اپنی قوم کی رہنمائی فرمائی۔ آپ نے اپنے اُسوہ حَسنہ سے دوسری قوموں کو بھی اپنے وطن اور اپنی قوم سے والہانہ محبت وپیار کا سبق سکھایا ہے۔

ان تمام شہادتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بات بہت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم اور سنت کی رو سے دین اسلام اہلِ عرب کی طرح غیر عرب دنیا کے لئے براہ راست تبلیغی یا عالمگیر بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔ اسی لئے آپ کے عہدِ مبارکہ اور خلفائے راشدہ کے عہد میں ہمیں اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُنہوں نے اپنے دین کی تبلیغ واشاعت میں اندرونِ عرب کی طرح کبھی کسی ادنیٰ ترین ذوق وشوق کا بھی مظاہرہ کیا ہو۔ پھر ان کے بعد اس دین کی باگ ڈور جب عرب کے دوسرے فرماں رواؤں کے قبضہ میں آئی تب بھی سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت کے، یہ دین کبھی غیر عرب دنیا کے لئے تبلیغی نہیں رہا۔ البتہ جب عباسیوں کے دور میں آہستہ آہستہ اسلام عجمی قوموں کی مشق میں آنے لگا تو ان کے علماء ومشائخ اور بعض صوفیائے کرام نے جن میں اسماعیلیہ فرقے کے لوگ بھی شامل تھے، اپنے اپنے ملک کے سیاسی غلبے کے لئے اسے غیر عرب دنیا کے سامنے ایک عالمگیر اور تبلیغی دین کے طور پر پیش کرنا شروع کیا، جس سے یہ صدیوں سے چلا آرہا ایک خاندان کا آبائی دین، پہلے رومیوں اور پھر ایشیائے کوچک اور مشرقی عجمیوں کے ذریعہ دو بڑے عالمگیر مذاہب یعنی عیسائیت اور اسلام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کی تورات یا قرآن جیسی کتابیں دراصل متحمل ومدّعی نہیں تھیں۔

خدا کے نزدیک قرآن کو سمجھنے کی اہمیت

قرآن کریم کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی اہمیت کا اندازہ ہم صرف اس ایک آیت سے بخوبی لگا سکتے ہیں، جس میں فرمایا گیا " اے وہ لوگو جو (مجھ پر اور اس کتاب کے تمام فرمودات پر) ایمان لا چکے ہو، نماز (میں اس کی تلاوت) کے قریب تک نہ جاؤ جب تک کہ تم نشہ کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ تم جو تلاوت کرتے ہو اس کا مقصد و مفہوم اچھی طرح سمجھنے کے قابل نہ ہو جاؤ۔" (النساء:۴۳) اب "وانتم سکٰری" کے الفاظ منسوخ ہیں۔

آیت کریمہ سے ہمیں قرآن کے مقصدِ نزول اور اس کے احکامات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ اُس زمانے کے لوگوں سے کہا جارہا ہو جب عربی ادب اُس انتہا کو پہنچ چکا ہو کہ عرب کے غلام بھی اپنی زباں دانی پر فخر محسوس کرنے لگے ہوں۔ پھر جبکہ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اس کلام کے اصل مخاطب، نشہ کی حالت میں بھی ہمارے اس زمانے کے غیر عربوں سے کہیں زیادہ اس کی باتوں کو سمجھ لیتے ہوں گے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی بات کے سمجھانے میں کسی کی ذرا سی بے توجّہی بھی گوارہ نہ تھی، اسی لئے فرمایا بلکہ حکم دیا کہ تم ایسی حالت میں اس کے پڑھنے پڑھانے کو چھوڑ ہی دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔

یقیناً اس بات کا اطلاق از روئے اصول اس کی تلاوت پر بھی ہونا چاہئے، کیونکہ اس کی تلاوت کا ثواب (یعنی نفع یا نیک بدلہ) بھی اُسی وقت پہنچ سکتا ہے کہ جب اس کے مفہوم اور مقصدِ نزول کو سمجھ کر اُس پر عمل بھی کیا جائے۔ جبکہ اس زمانے کے ہم جیسے غیر عربوں کی تو یہ حالت ہے کہ ہمارے ننانوے فیصد سے بھی زیادہ لوگ باہوش و حواس نہ صرف اس کے دقیق معانی و

مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ اس کی عبارت کے عام جملوں کا مطلب بھی سمجھنا دشوار ہے۔ پھر اس دشواری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کلام ہمیں یا ہمارے زمانے کے لوگوں کو مخاطب کر کے نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا بیشتر حصّہ بعد کے زمانے والوں کیلئے حسب حال بھی نہیں رہا ہے، جیسا کہ یہ اپنے اصل مخاطبوں کیلئے کبھی حالاتِ حاضرہ سے ہر وقت متعلق رہا کرتا تھا اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ نسخ کا عمل بھی جاری رہا کرتا تھا۔

قرآن کریم کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے کا اندازہ ہمیں صحابہ کرام کے عمل سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت منقول ہے کہ:

" ہم میں سے جو شخص بھی قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھ لیتا تو وہ اُس وقت تک اُن سے آگے نہ بڑھتا جب تک اُن کے معنی (و مقصد) سے اچھی طرح واقف نہ ہو لیتا اور اُن پر عمل کرنے نہ لگ جاتا۔"

یہ اُن لوگوں کی بات ہے جنہوں نے آنحضرت کا زمانہ پایا تھا اور قرآن کریم کی عربی زبان جن کی اپنی ہی مادری تھی۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کو صرف کتاب نازل کرنے کی حجّت ہی پوری کرنی ہوتی تو اللہ اُن سے پہلے دو گروہوں پر اپنی (مُفصل) کتابیں نازل فرما چکا تھا، جو خود اُن کے اپنے ہی خاندان کے افراد پر نازل کی گئی تھیں، وہی ان کے لئے بھی کافی ہوتیں جس طرح آج قرآن کریم کو نہ سمجھ میں آنے کے باوجود تمام دنیا کی ہدایت کے لئے کافی سمجھا جا رہا ہے۔ مگر ہمیں یاد ہونا چاہئے کہ اسی قرآن میں اُس وقت کے عربوں نے ان کتابوں کو محض ان کے غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ کتابیں اب محرّف ہو چکی ہیں، بلکہ اُس وقت اعتراض ان کتابوں کے مضامین سمجھ میں نہ آنے اور اُن کا غیروں پر نازل کئے جانے پر تھا، جیسا کہ سورہ الانعام: ۱۵۷ اور اسی سورہ کی آیت ۱۵۶ میں ذکر ہے۔ اس جگہ لفظ "لو اَنَّآ اُنزِلَ عَلَيۡنَا" یعنی "اگر کتاب ہم پر اُتاری جاتی" کہہ کر مُغائرت کا صاف الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے۔

(برائے مہربانی اسے اللہ سے کوئی نیا مطالبہ نہ سمجھا جائے کیونکہ نبوّتوں کا سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے)

اگر وہ کتابیں مُحرف ہو چکی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ یہاں "وإنْ كُنّاعن دراستهم لغٰفلين" (٦:١٥٦) ہم اُن کے اسباق سے غافل ہی رہے" کی جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا کہ وہ دونوں کتابیں مُحرف ہو جانے کی وجہ سے اب اس لائق ہی نہیں رہیں کہ اُنہیں مجھ سے منسوب کیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا کیونکہ اُسے اُن کے متوقع اعتراض کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ عربی بولنے والوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور یہ کہ نہ صرف وہ ان کی اپنی زبان میں نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے زمانہ اور حالات سے بھی مطابقت نہیں رکھتیں۔ رہا کلام الٰہی کو کسی کے کئے ہوئے ترجموں اور تفسیروں کے ذریعہ سمجھنے کی بات تو اس کے لئے خود رسول اللہ نے فرمایا تھا:

> جس زبان کا تمہیں علم نہیں اس کی (اس زبان کی) کتاب الٰہی پر مجملاً (یعنی سرسری طور) ہی ایمان لانا چاہیئے۔"

جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ:

> "یہودی تورات عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے اور مسلمانوں کو عربی زبان میں (ترجمہ کرکے) اس کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا، " ان کی باتوں کو بالکل سچ بھی نہ مانو اور بالکل جھوٹ بھی نہ کہو، بلکہ مجملاً کہو کہ "اٰمنا باللہ وما اُنزِل الینا الآیۃ (ہم اللہ پر ایمان لائے اور اُن پر بھی جو نشانیاں اُن پر اُتریں)[1]

چنانچہ فرمانِ رسولِ کریم کے مطابق غیر عرب دنیا کے لئے عربی قرآن الٰہی کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ نہ سمجھ میں آنے والی ہر زبان کا علم مجملات ہی کا درجہ رکھتا ہے، جس کی تفہیم ہمیشہ باقی ہی رہے۔ نیز یہ بات اللہ تعالیٰ کی سنت کے بھی خلاف تھی کہ وہ کسی قوم کو ایسی کتاب پر ایمان لانے پر مجبور کرے جو اُس کی سمجھ میں ہی نہ آتی ہو۔ تیسرے شریعت میں حکمت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری تھا اس لئے کہ ہر قوم کی شریعت کے تقاضے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے کسی غیر زمانے اور قوم کی شریعت پر جوں کا توں کسی بھی دوسری

1- دیکھئے، تجرید بخاری، کتاب تفسیر القرآن، ص ٨٠٩، نیز دیکھئے، بخاری جلد سوم، ص ٩٢٠-٩٢١، شائع کردہ، دین محمد اینڈ سنز، لاہور

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

قوم کو ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی ایک الگ ہی طرزِ معاشرت اور الگ تمدن ہوا کرتا ہے۔ اس بات کا اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ خیال بھی رکھا ہے۔

شاید بعض لوگ اپنے پاس اس کا یہ جواب رکھتے ہوں کہ عربی زبان سیکھی جا سکتی ہے، تو کہا جائے گا کہ عرب بھی تو عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھ سکتے تھے۔ پھر کیوں نہ اُنہوں نے تورات و انجیل کے تراجم کرا کے اپنا کام چلا لیا اور کیوں اللہ تعالیٰ نے اُن کے متوقع اعتراضات کو قابلِ اعتناء سمجھا؟ جس کے بعد ان کے لئے عربی زبان کا قرآن نازل بھی فرما دیا اور عرب جاہلیہ یعنی ان کے اپنے خاص ماحول اور معروفات کے مطابق ہی ان کی شریعت کو مرتب بھی کر دیا۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مرضی تھی کہ وہ جس زبان میں چاہے اپنا کلام نازل فرما سکتا ہے۔ تو کہا جائے گا کہ پھر اس کے ساتھ ہی یہ حکم نازل فرمانا بھی اشد ضروری تھا کہ ہر اسلام قبول کرنے والے پر عربی زبان کا سیکھنا بھی فرض کیا جاتا ہے۔ جو کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا۔ اور ایسا حکم اللہ تعالیٰ کی اپنی ہی سنت کے بھی خلاف ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم قرآن حکیم میں نازل ہی نہیں ہوا۔ اور نہ ہی رسول کریم سے ایسی کوئی روایت منقول ہے کہ جس کی رو سے تمام غیر عربوں کو اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی عربی سیکھنا بھی فرض ہو جاتا اور اگر ایسا ہوتا تو نعوذ باللہ خدا پر جانبداری کا الزام آجاتا جبکہ خدا تو رب العالمین ہے۔ نیز اس کی بھی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے کہ عربی سیکھ لینے کے بعد قرآن کریم کی تمام حکمتیں بھی اُس پر ظاہر ہو جائیں گی اور قرآن کے تمام مقاصد اُس کے لئے بغیر کسی تفسیر و تشریح کے صحابہ کبار کی طرح صاف صاف سمجھ میں آجائیں گے۔ جبکہ قرآن کریم کا بیشتر نزول خاص اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور اِردِ گرد کے موجودہ ماحول سے ہی متعلق رہا ہے۔

پس اس کے بعد بھی ہم جو غیر اقوام، عرب کے قومی دین پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں اس کی وجہ یا تو یہ ہمارا اپنا شوقِ حق شناسی ہے یا اپنے بزرگوں کی پسند کا احترام یا پھر ہر مذہب والوں کی طرح ہمیں بھی اپنے پیدائشی طور پر ملے ہوئے مذہب سے فطری عقیدت ہو سکتی ہے، ان میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے تمام دیگر مذاہب کا گہرا مطالعہ کرنے کے

بعد اسی پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہو یا اپنا کوئی پُرانا مذہب چھوڑ کر اپنی ذاتی پسند سے اسے قبول کیا ہو۔ ایسی صورت میں ہندی نژاد لوگوں پر حافظ شیرازی کا یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے ؏

مردمِ دیدہ تیمم کند از خاکِ درت
گرچہ در خانۂ خود آبِ روانے دارد

غیر عرب دنیا کے لئے فہم القرآن جیسے مسئلہ پر مرزا غالب ایک جگہ فرماتے ہیں ؏

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ میرا ہم زباں نہیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مرزا غالب نے یہ شعر اپنے کلام کی ناقدری کے سلسلے میں کہا تھا یا قدر دانی ظاہر کرنے کے لئے کہ میرے کلام کی اگر کچھ داد ملتی بھی ہے تو اس طرح کہ داد دینے والا میری زبان تک سے واقف نہیں ہوتا۔ بہر حال جہاں تک روح القدس اور مرزا غالب کے اشعار فہمی کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ روح القدس مرزا غالب کی زبان سے واقف تھے یا نہیں۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ روح القدس کا جو کلام یہاں زیر بحث ہے، اہلِ عجم واقعی اس کے سمجھنے کے معاملے میں عجمی یعنی گونگے اور بہرے ہی ہیں۔ چنانچہ ایسی حالت میں ہمارا معاملہ اس کے برعکس کچھ اس طرح ہو جاتا ہے ؏

پاتا ہے داد روح القدس عربی کلام کی
اہلِ عجم سے گرچہ وہ اہلِ زباں نہیں

یا پھر ہمارا حال بقول علامہ اقبال وہی ہے کہ اگرچہ ہم نغمہ ہائے صحرا سے تو واقف نہیں مگر پھر بھی شریکِ نغمہ ہائے ساربان ہیں ؏

ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے ساربانم
اقبال ارمغان حجاز

رسول کریم کن کی طرف مبعوث کئے گئے؟

یہاں ہم قرآن کریم سے چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن سے اس بات کی واضح طور پر نشان دہی ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ذریعہ پہنچنے والا پیغام صرف اُن لوگوں تک ہی محدود ہے جو اپنے خاندان میں نازل ہونے والی کتابوں کی رُو سے ایک نبی کے آنے کا بڑی شدّت کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

اہلِ کتاب کا آنحضرت پر ایمان لانا بھی صرف اس بات پر موقوف رکھا گیا تھا کہ آپ کی آمد کا ذکر پہلے سے اُن کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، جو نسلاً حضرت ابراہیم کی نسبت سے حضرت اسحاق کی اولاد پر مشتمل تھی۔ جب نبوت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کی طرف منتقل ہو گئی اور بنی اسمٰعیل بھی اہلِ کتاب میں شمار ہونے لگے تو اپنے آبائی مذہب کے حوالے سے حضرت ابراہیم کی دونوں اولادوں کے درمیان اتحاد قائم کرنا ایک فطری تقاضہ بن گیا تھا۔ لہٰذا رسول کریم کو حکم دیا گیا کہ:

(آپ) کہہ دیجئے، اے اہلِ کتاب آؤ ایسی بات کی طرف جو ہم میں
اور تم میں باہم مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ
کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھرائیں (آلِ عمران:۶۴)

اگر یہ بات اور ادیان کے درمیان بھی پہلے سے مشترک ہوتی تو اس آیت میں اُنہیں بھی ایک ساتھ مخاطب کیا جاتا۔ جس کی بنا پر رسولِ کریم جب یہودیوں سے مخاطب ہوتے تو اُن کو حلف (یعنی خدائے واحد کی قسم) دے دے کر پوچھتے کہ "کیا تم تورات میں میرے آنے کی پیشگوئی نہیں دیکھتے؟ اگر تم قسم کھا کر کہو کہ نہیں تو پھر تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں.. اس میں اُن کو خدا کی نعمتیں

بھی یاد دلائی گئی ہیں اور تورات کی بشارتوں کے مصداق پر ایمان لانے کی دعوت بھی یہی کہہ کر دی گئی ہے کہ اگر واقعی تورات میں (میرا) ذکر نہ ہو تو پھر تم سے کوئی خصوصی مطالبہ نہیں[1]۔"

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا آپ ﷺ کی بشارت دیگر آسمانی کتابوں میں بھی وارد ہوئی ہے؟ جن کے آسمانی ہونے کی قرآن کریم نے کہیں کوئی تصدیق نہیں کی ہے۔ سوائے اس بات کے کہ ہم نے تمام قوموں کی طرف الگ الگ پیغمبر اور رسول بھیجے ہیں۔ اگر دنیا کی دیگر مقدّس کتابوں میں بھی آپ کی آمد کا ذکر تورات و انجیل کی طرح آپ ﷺ کی نبوت کا مکلف بنانے کے لئے ضروری ہوتا تو قرآن کریم میں اُن کتابوں میں سے کم از کم چند کا ذکر تو ضرور کیا گیا ہوتا۔ جس سے اُن کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق بھی ہو جاتی اور آپ کی تمام دنیا کی طرف مبعوث کئے جانے کی واضح تصدیق بھی ہو جاتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول نے ایسا کوئی مطالبہ عجمی قوموں سے قرآن کے حوالے سے کبھی نہیں کیا۔

جہاں تک خود یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں آپ کے بارے میں بشارتوں کا ذکر ہے اُن کے لئے جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں:

> "بے شبہہ اُن کی مذہبی روایتوں میں ایک نبی کی بشارت اور پیشگوئی تھی۔ لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ اس کے عربوں (یعنی بنی اسمٰعیل) میں سے ہونے کی کس حد تک توقع کرتے تھے..... البتہ وہ انتظار ضرور کر رہے تھے۔ مگر یہودی چاہتے تھے کہ اُس نبی کی آمد سے خود حکمراں جماعت بر بنائے نسل بن جائیں إنّ أکرمَکُم عند اللہ أتقاکُم کی عمومیت اُنہیں پسند نہیں تھی[2]۔"

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی مِنْ کُم، من انفسکُم، اور کنتُم وغیرہ فرمایا ہے وہاں مراد قومی نقطہ نظر سے ان کے اپنے ہی لوگوں میں سے ہے، نہ کہ اپنے اور غیروں سب میں سے۔

1- رسول کریم کی سیاسی زندگی، ص ۳۲۷، از ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی، مطبوعہ، ادارۂ اسلامیات، انار کلی لاہور۔ نیز دیکھئے آپ کے سیاسی وثیقہ جات، ص ۴۰

2- رسول کریم کی سیاسی زندگی، ص: ۳۲۶، ۳۲۷

چونکہ رسول کریم کے ذہن میں بربنائے نسلِ ابراہیم علیہ السلام دونوں فرزندوں کی اولاد کا ایک ہی نسل سے ہونا تھا، اس لئے آپ نے اپنی نبوت اور اُن کی کتابوں کی بشارتوں کا تعلق بھی ایک ہی مشترکہ قوم سے سمجھ لیا تھا۔ اُس وقت اگر یہودیوں میں ذرا بھی وسعتِ قلبی ہوتی تو ان دونوں قوموں کا ایک ہو جانا ممکن اور ہمیشہ کے لئے دونوں کے حق میں بہتر بھی ہوتا، اسی بھائی چارے کے جذبہ سے آنحضرت نے اپنی بعثت جن لوگوں کی طرف سمجھی اُن کی الہامی کتابوں کے حوالے سے اُن پر حجت کو پورا کر دیا، یہودیوں کی طرف سے مکمل مایوسی کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود بھی فرمادیا تھا کہ:

> (اب) ہم نے مقرر کیا ہے تم میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت کا کھلا راستہ (شِرعةً وّمِنهاجاً) اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک امتِ واحدہ بنادیتا لیکن پھر چاہا گیا کہ تمہیں اُس میں آزمائے جو تمہاری طرف نازل کیا گیا، اس لئے تم نیکیوں میں اُن پر سبقت لے جاؤ" (مائدہ:۴۸)

جب کہ ان کے علاوہ کسی عجمی قوم کی مذہبی کتاب کے حوالے سے ایسی کوئی حجت قائم نہیں کی گئی تھی۔

جہاں تک آرین قوموں کا تعلق ہے تو ان کے یہاں نبوت کا ایسا کوئی سلسلہ ہے ہی نہیں کہ جسے اسلامی اصطلاح میں الہامی کہا جاتا ہے۔ نبوت کرنا آرین قوموں کا وصف کبھی رہا ہی نہیں۔ "نبی" اور "اوتار" دو بالکل الگ الگ مزاجوں کے ترجمان یا انسٹیٹیوشن (institution) ہیں۔ اور ادارۂ نبوت کے بانی مبانی صرف حضرت ابراہیم ہی تھے ان کے بعد اُن کے دونوں بیٹوں کی اولاد نے اس ادارے کو خود ختم کر دیا تھا اس کی جگہ اب وہ خود بھی اپنے جدید مسائل مذہبی مناقشوں کے ذریعہ حل کرنے کے بجائے عقل اور سائنس پر زیادہ توجہ دینے لگے ہیں اس لئے اب اُن پُرانے کہانت یا نبوت کے اداروں کو دوبارہ جاری کرنے کا حق ہرگز کسی بھی قوم کے افراد کو زیب نہیں دیتا۔ جو لوگ اسلام کو ایک عالمگیر تبلیغی مذہب ثابت کرنے کیلئے ویدوں سے اس قسم کی پیشگوئیوں کو منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وید

سرے سے الہامی کتابیں ہیں ہی نہیں کہ ان میں کبھی حضرت ابراہیم کا قادرِ مطلق خدا گویا ہوا ہو۔

قرآن کریم کے بارے میں تو کچھ کہنا، عباسی دور کے مناظروں کو دوبارہ دعوت دینا ہے، مگر ویدوں کے بارے میں کسی حد تک وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف ادوار میں مختلف انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں، انہیں تو صرف تشبیہاً ہی الہامی کہا گیا ہے۔

حضرت اسمٰعیل عَلَیْہِ السَّلام کی اولاد پورے عرب میں یعنی مکہ اور اس کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی اس لئے نزول مکہ کی آیات میں فرمایا گیا تھا "وکَذٰلِکَ اوحینآ اِلَیکَ قُراٰناً عربیّاً لِّتُنذِرَ اُمَّ القُریٰ ومن حولھَا... "اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کیا قرآن عربی (زبان) میں تاکہ ڈرائے جائیں اُمّ القریٰ (اہلِ مکہ) اور اس کے اِرد گرد جو لوگ آباد ہیں" (الشوریٰ:۷) ان کے علاوہ بعد میں بھی قرآن کریم کے ذریعہ صرف آلِ اسحاق اور حضرت عیسیٰ کی نسبت سے اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ کو ہی بار بار مخاطب کیا گیا ہے۔ ایسی تمام تبلیغ کو جو نام بنام پیش کی گئی ہو اسے کسی بھی طور عجم کے رہنے والوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ حج میں فرمایا "مِلّة اَبِیکُم ابراھیمَ "...یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔" (۲۲:۷۸) یا سورہ یوسف میں فرمایا" مِلّةَ اٰبآئی ابراھیم واسحٰق و یعقوبَ.... (۱۲:۳۸) اور میں نے اپنے باپ دادا، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی" باپ دادا سے یہاں صرف وہی لوگ مراد ہیں جو آخر وقت تک اپنے صحیح دین پر قائم رہے۔ اِن آیات کے خطاب سے وہ تمام لوگ خارج سمجھے جائیں گے جو اولادِ ابراہیم سے نہیں ہیں۔ ورنہ آپ خود ہی اپنی ماؤں پر الزام کے مرتکب ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس دین کی تبلیغ کا سب سے بڑا جواز یا سب سے بڑی دلیل اس کا آبائی ہونا ہی بتایا جاتا تھا۔ اور کیا کسی ایسے دین پر جسے اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالمگیر بنانے کا ہو اُس پر "مِلّةَ اَبِیکُم اِبرٰھِیمَ" تمہارے باپ ابراہیم کے دین" کا لیبل لگایا جا سکتا ہے؟

اور کیا کوئی غیرت مند شخص یا قوم محض کسی مذہب کو اختیار کرنے کے لئے کسی اور شخص

کے باپ کو اپنا باپ تسلیم کر سکتی ہے؟ خواہ اُس کا اپنا باپ کتنا ہی حقیر اور ذلیل ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے کا کتنا ہی باعزت اور عظیم۔

اور اگر اِس پر بھی کوئی غیر ابراہیمی قوم یا اشخاص اس دین کی ہر ہر بات کو جو قرآن میں لکھی ہے اپنے سے متعلق سمجھنے لگ جائے تو گویا وہ حضرت ابراہیم کو بھی جو دراصل اُن کا باپ نہیں اپنا باپ تسلیم کرتے ہیں۔ جس کے لئے آنحضرت کا ارشاد ہے، جو حضرت سعد اور ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"یقول من ادعیٰ الیٰ غیر اَبیہ و ھو یعلم فالجنّۃُ علیہ حرام"

فرمایا رسول کریم نے جو اپنے تئیں غیر باپ کی طرف منسوب کرے حالانکہ وہ جانتا ہے (کہ جس کی طرف وہ نسبت دے رہا ہے وہ اُس کا باپ نہیں) تو اُس پر جنت حرام ہے[3]۔

نیز جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا تو آنحضرت ﷺ کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیس وفد نے آپ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ اور ہم، ہم خاندان نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہم نصر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کر سکتے ہیں[4]۔"

ایک اور موقعہ پر بھی آپ نے فرمایا تھا:

"من ادعیٰ الیٰ غیر ابیہ و انتمی الیٰ غیر والیہ فعلیہ لعنۃ اللہ"

جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے[5]

اِن احادیث نبوی کی سماعت کے بعد کیا کوئی غیر ابراہیمی شخص قبولِ اسلام سے پہلے یا جب بھی اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دین اُس کے اپنے باپ دادا کا آبائی دین نہیں ہے تو قرآن کریم کی اس دلیل پر کہ:

3- تجرید بخاری، حصّہ دوم، حدیث نمبر ۴۸۸، ص ۷۶۶، اور ۹۷۷، ۹۳۷
4- زاد المعاد، جلد ا ص ۳۲، مطبوعہ مصر، بحوالہ سیرت النبی، جلد دوم، ص ۲۷
5- سیرت النبی، جلد دوم، ص ۱۵۸

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

"مِلَّةَ اَبِیکُم اِبرٰھِیم اور مِلّةَ اٰبآءی ابراھیم واسحٰق ویعقوب"

"یہ دین تمہارے باپ ابراہیم کا اور تمہارے اپنے باپ دادا کا دین ہے"

یہاں، تمہارے باپ دادا کے دین پر سکوت اختیار کر کے خود کو جنت سے محروم رکھنا یا رسول کریم ﷺ کی طرف سے دی ہوئی لعنت کے عذاب کو برداشت کرنا پسند کرلے گا؟ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ قرآن کریم کے ذریعہ سورہ حج اور اس قسم کی دوسری دعوت دین کے صرف وہی لوگ مخاطب ہیں جن کے حضرت ابراہیم باپ کہلائے جاسکتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے غیر قوموں کو بھیجے گئے سیاسی حکم ناموں میں دی گئی رسمی دعوت، قرآن کریم کی باقی اہلِ عرب کو دی گئی دعوتِ دین سے بالکل مختلف تھی۔ ایک تو اُن دعوت ناموں میں قبول دین کے لئے اہلِ عرب کی طرح اُنہیں کوئی دلیل یا حجت نہیں پیش کی گئی تھی، دوسرے اہلِ عرب کو صرف اور صرف اسلام قبول کرنے کی ہی دعوت دی جاتی تھی اُس میں اُنہیں انکار کی صورت میں جزیہ کے عوض آزادیِ دین کی پیشکش بھی نہیں کی جاتی تھی، جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے قومیت اور صلہ رحمی کے تحت اپنوں اور غیروں کے درمیان ایک نمایاں فرق تھا۔ کیونکہ آپ کو صرف ایک امت کی طرف ہی رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسی لئے فرمایا "کذالکَ ارسلنک فی امّةٍ" اسی طرح ہم نے آپ کو (پہلے سے) ایک عقیدے کے ماننے والوں کی طرف بھیجا" (رعد: ۳۰) کیونکہ "فی امّةٍ" کا اطلاق بھی تمام امتوں یا تمام دنیا کے لوگوں کی طرف نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی قرآن میں ایسے کوئی جملے نازل نہیں فرمائے کہ:

(ہم نے آپ) کو تمام دنیا کی قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، تاکہ آپ کے ذریعہ، حال اور مستقبل کے تمام لوگوں کو، ہمیشہ قائم رہنے والی ایسی شریعت عطا کر دی جائے جو ہر زمانے اور خطہ کے لئے یکساں قابلِ عمل رہے۔ اور آپ اپنے ایمان لانے والوں سے کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو ساری دنیا تک پہنچا دو۔ اور کہہ دیجئے کہ عرب کی طرح باقی تمام دنیا میں بھی جزیہ کے عوض کفر کو فروغ

دینا حرام ہے۔(غیر از وحی)

چونکہ یہ دین عالمگیر اور تبلیغی نہیں تھا، اسی لئے قرآن کریم میں فرمادیا گیا تھا:

"لقد انزلنا اِلیکُم کِتٰباً فِیہ ذِکرُکُم اَفَلا تَعقِلُون"

تحقیق جو کتاب ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے اس میں تمہارے (اپنے ہی لوگوں کا) تو ذکر ہے، تو کیا تم (اس بات پر) غور نہیں کرتے۔(الانبیاء:۱۰)

اس کے علاوہ بھی آپ کو ہدایت کے سلسلے میں قرآن کریم میں جابجا صرف آلِ ابراہیم کا ہی ذکر ملے گا۔ تاریخ سے دوسری قوموں کے ذکر بھی اِنہیں ہی عبرت کے لئے سنائے گئے ہیں، اسی لئے بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں کی الہامی کتابوں میں بیشتر اُن کے اپنے قومی اور خاندانی مسائل پر صرف اِن کے اپنے لوگوں کو ہی مخاطب کیا گیا ہے۔

البتہ بعض جگہ انتہائی غیر مُفّصَل جملوں سے مترجمین نے مبالغہ آرائی کے ذریعہ اُس واحد جملے کو انتہائی وسیع معنی پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کی ہے کہ یہاں اِن کے معنی تمام بنی نوع انسان ہیں۔ مثلاً "یا ایّھا النّاس یا قُل یا ایّھا النّاسُ انّی رسول اللہ الیکُم جمیعا" وغیرہ جس کی تفصیل آگے ملے گی۔

Jurat-e-Tehqiq

یَاایُّھاالنّاسُ یایَاقَومِ

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں حضرت ابراہیم عَلَیہِ السّلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اِنّی جاعِلُکَ لِلنّاسِ اِمَاماً ہم تم کو لوگوں کا امام (یعنی پیشوا) بنانے والے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں کئی جگہ یہ لفظ تورات کے بارے میں بھی آیا ہے: " کہہ کس نے وہ کتاب اُتاری جو موسیٰ لایا، نوراً وّھُدًی لِلنَّاس (الانعام:۹۱) یعنی تورات اپنے اندر لوگوں کیلئے نور اور ہدایت رکھتی تھی۔"

ایک دوسری جگہ سورہ القصص کی آیت ۴۳ میں تورات ہی کے بارے میں پھر فرمایا: بصائر لِلنّاس وھدًی وّرَحْمَۃً لوگوں کیلئے تورات بصیرت اور ہدایت و رحمت ہے۔ یا سورہ آلِ عمران میں تورات اور انجیل کے بارے میں بھی یہی فرمایا "ھدًی لِلنّاس (آل عمران:۳-۴) اِن تمام آیات میں "لِلنّاس" سے اللہ تعالیٰ کی مراد انبیاء کی اپنی اپنی قوموں کے افراد سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ (جن کا قرآنی مفہوم انبیاء کے اپنے اپنے خانوادے اور قبیلے ہیں) کیونکہ آپ کے علاوہ جتنے بھی انبیاء دنیا میں تشریف لائے وہ سب کے سب صرف اپنی اپنی قوم کی طرف ہی بھیجے گئے تھے۔ اس لئے "لِلنّاس" سے یہ استدلال کرنا کہ اس کا اطلاق تمام بنی نوعِ انساں پر ہوتا ہے اور نہ صرف کسی ایک زمانے کے لوگوں پر بلکہ ہر آنے والے نئے زمانے کے لوگوں پر بھی یکساں ہوتا ہے کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ جبکہ اسلام سے پہلے اس لفظ کے معنی صرف انبیاء کرام کے اپنے قبیلے یا خانوادے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم سے پہلے قوم کا تصور اتنا وسیع نہیں تھا۔ رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے تشریف لا کر دنیا کو سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ قوم صرف خانوادے یا قبیلے تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ اپنے جدِ امجد کی پوری نسل اور کسی علاقے میں رہنے والے وہ تمام افراد بھی ایک ہی قوم کے افراد تصور کئے جائیں گے خواہ اُن کا نظریہ حیات کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ جس

میں گورے اور کالے کی بھی کوئی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اسلام کے نزدیک صرف دو ہی قومیتوں کا تصور ہے ایک وہ جو اسلام کے نظریہ حیات سے متفق ہو اور دارالسّلام کی وطنیت بھی رکھتی ہو۔ اور دوسری وہ جو اسلام کے نظریہ حیات سے متفق نہ ہو۔ اِن میں تخصیص کیلئے متفق افراد کے وہ تمام لوگ جن کا وطن جزیرۃ العرب تھا وہ سب ایک قوم کے افراد تصور کئے جانے لگے۔ خواہ وہ ابھی ایمان نہ بھی لائے ہوں اور اگر اُن میں سے کوئی عربی قومیت رکھنے والا شخص متفق ہونا پسند نہ کرتا تھا تو انفرادی طور پر اُس سے کوئی تعرّض نہیں کیا جاتا تھا، لیکن اگر ایسے افراد کا تعلق کسی گروہ یا قبیلے سے ہوتا تو ان سے جنگ کی جاسکتی تھی اور اُنہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور بھی کیا جاسکتا تھا یا پھر اُنہیں جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ نجران کے عربوں کو جلاوطن کیا گیا اور جزیہ دینے کی رضامندی کے باوجود اپنے ہی وطن میں رہنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔

قدیم مسلم عربوں کے نزدیک عرب سے ملحق دوسری قومیت رکھنے والوں کا قتال بالخصوص جائز تھا یہاں تک کہ وہ جزیہ کے ساتھ اطاعت قبول کر لیں۔ مگر افسوس کہ اُن کے بعد عجمی مسلمانوں نے بھی عربوں کے اس قومی امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے ہی خلاف باقی تمام عجمی دنیا کیلئے قبولِ اسلام یا جزیہ کی ادائیگی تک بالعموم برسرِپیکار رہنے کو اب بھی جائز سمجھا ہوا ہے، جبکہ عرب کے سوا دیگر اقوام کے لئے یہ مذہب سرے سے تبلیغی تھا ہی نہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا"....کان النّبی یبعثُ الیٰ قومہ خاصۃً و بعثتی الی الناس کافۃً" مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی (نبی) کو نہیں دی گئیں، (۱ تا ۴ کے بعد) پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ "مجھ سے پہلے ہر نبی خاص طور پر اپنی قوم کی طرف ہی مبعوث ہوا کرتا تھا۔ مگر میں عام لوگوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہوں[1]۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے اہلِ عجم کے لئے غلط فہمیوں کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ لفظ قوم کے مفہوم نے جو وسعت ظہور اسلام کے بعد اختیار کی ہے وہ اب ایک چیستاں بن چکی ہے۔

1- تجرید بخاری، کتاب التیمم، حدیث نمبر ۲۱۷، ص ۹۳

آدم صفی اللہ کی اولاد پر نازل ہونے والی آسمانی کتابوں میں حضرت نوح سے لے کر حضرت عیسیٰ کی وفات تک عموماً قوم کا لفظ صرف کسی بڑے خاندان یا قبیلے کے لئے ہی بولا جاتا تھا۔ اسلام کی آمد تک اجتماعی قومیت کا کوئی تصور عربوں میں پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ اسلام نے آ کر انہیں اجتماعی قومیت کا ایک بالکل ہی نیا تصور عطا کیا۔ کیونکہ آپ ﷺ صرف اپنے خاندان یا قبیلۂ قریش کی طرف ہی مبعوث نہیں کئے گئے تھے بلکہ اُس نئے تصور کے ساتھ پوری قوم یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل پر مشتمل نسلِ ابراہیم علیہ السلام کے تمام افراد کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اسی لئے آپ نے اپنے ابتدائی خطبے کے علاوہ، جس میں آپ نے "یا آلَ فھر، یعنی مَعْشَر قریش کہہ کر پکارا تھا اس کے بعد خود یا قرآن کے ذریعہ، عربوں کے عام مفہوم میں کبھی بھی "یاقومی" کہہ کر نہیں پکارا کہ جس سے آپ کا پیغام صرف قریش قبیلے کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا۔ مگر عرب میں بسنے والے بنی اسرائیل نے قومیت کی اس نئی تعریف سے اتفاق نہیں کیا، جس کے بعد مجبوراً دین حنیف کے بجائے اسلام کے نام سے عربوں کو خالص عرب نیشنلزم پر اپنی اسلامی حکومت بنانی پڑی جو دارالسّلام کہلائی جہاں سے پھر ایسے یہود و نصاریٰ خارج کر دئے گئے تھے جو اس نئے قومی تصور سے متفق نہیں تھے جس میں جزیرۃ العرب کے غیر مسلموں کو بھی وہی مساویانہ شہری حقوق دینے سے عرب نیشنلزم کو خالص نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے ان کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھینچ کر مملکتِ اسلامیہ میں سرزمین عشر و زکوٰۃ اور سرزمینِ جزیہ و خراج قائم کی گئیں جو ایک مملکت ہوتے ہوئے بھی کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس کے نتیجہ میں خلافت راشدہ ایک ایسا اسلامی معاشرہ بنا جس میں ایک ساتھ دو الگ الگ اقتصادی و معاشرتی نظام رائج تھے، ایک باشندگانِ عرب کے لئے یعنی عشر، زکوٰۃ اور بت پرستی سے پاک معاشرہ اور دوسرا جو حدود عرب سے باہر مفتوحہ علاقوں میں رائج تھا یعنی جزیہ و خراج اور شرک اور بت پرستی پر مبنی معاشرہ، یعنی وہ معاشرہ جو مسلمانوں کے قبضے سے پہلے غیر اسلامی معاشرہ کہلاتا تھا وہاں پہلے کی طرح شرک رائج رہا اور اُسے بھی اپنی نگرانی میں اسلامی نظامِ حکومت کا عادلانہ نظام کہہ کر پہلے کی طرح رائج رہنے دیا گیا۔

اس نئے قومی تصور کے تحت جہاں تک "یاایّھاالذین آمنوا" کا تعلق ہے تو یہ صرف اُن لوگوں تک ہی محدود تھا جو آپ کی حیاتِ طیبہ میں ایمان کی نعمت سے سرفراز ہو چکے تھے آپ کے بعد ایمان لانے والے "یا" کے زمرہ میں داخل نہیں سمجھے جاسکتے۔ اگر اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو از روئے عربی قواعد "یا" کا اطلاق صاف صاف صرف اُس وقت کے موجود اور حاضر افراد پر ہی ہو سکتا ہے جنہیں اُس وقت نام بنام پکارا گیا تھا۔ اُس کے بعد کسی غیر حاضر یا مستقبل کے انسان پر ہر گز نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ بعض محققین نے تو قرآن کریم کے اِن دونوں الفاظ "یاایھاالنّاس" اور "یاایُّھاالذین آمنوا" پر نہایت غور وخوص کے بعد ان کے طرز تخاطب اور نزول کی نشان دہی کرتے ہوئے اِس بات کا انکشاف کیا ہے کہ قرآن کریم کے ۳۰/۱۹ یعنی ۶۳ فیصد حصّے، جس کا تعلق رسول کریم کی ابتدائی زندگی سے ہے جو آپ نے مکہ میں گزاری جس میں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی آیتیں نازل ہوئی ہیں، کا طرز تخاطب عام طور پر "یاایُّھا النّاس" ہی ہے، اس لئے کہ اُس وقت تک لوگ آپ پر ایمان نہیں لائے تھے، جسے قرآن کریم کی ترتیب نزول سے با آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ آپ کی بقایا دس سالہ زندگی (جس کا تعلق مدنی دور سے ہے) میں عموماً خطاب مومنینِ وقت سے کیا گیا ہے، جیسے کہ آج ہم اپنی روز مرہ کی عام گفتگو میں اپنے ہم جماعتوں کو مخاطب کرنے کے لئے کہتے ہیں: "اے میری جماعت کے لوگو!" جس سے ہماری ہر گز یہ مراد نہیں ہوتی کہ ہم یہ خطاب موجودہ اور آئندہ آنے والے تمام دنیا کے لوگوں سے کر رہے ہیں اور یہاں تو "یا" کا استعمال خاص طور پر اُن کلمات کو اُس وقت کے موجود مومنین تک محدود کر دیتا ہے۔

ہمارے دور کے بعض خاص حضرات قرآن کی ان آیات (۲:۱۵۵ اور ۴:۶۹) کی رُو سے آنحضرت اور تمام دیگر انبیاء کرام اور شہداء کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ حضرات مختلف آسمانوں میں آج بھی ہماری طرح مادّی جسم کے ساتھ زندہ ہیں اس لئے موجود بھی سمجھے جائیں گے جو عربی زبان کے بنیادی قواعد پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں ورنہ جس طرح مرسل الیہ کا نام مراسلے کو مختص بالذات کر دیتا ہے ٹھیک اسی طرح "یا" کا استعمال بھی کلام پاک کے تمام

ایسے خطابات کو حاضر صحابہ کرام اور اُس وقت کے مخاطب مشرکین تک محدود کر دیتا ہے۔ حالانکہ آپ کے بعد صرف احکامات سے رہنمائی حاصل کرنے کے علاوہ اب کلام الٰہی کسی سے بھی مخاطب نہیں ہے۔ کیونکہ اس کلام کو متحرک و موثّر کرنے والے رسول کریم اب ہم لوگوں کے درمیان شخصی طور پر موجود نہیں ہیں۔ جیسے کہ اُس وقت سب کی نظروں کے سامنے موجود رہا کرتے تھے اور قرآن کریم کی ہر بات خود پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

"ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ (قرآن کی باتیں خود) پڑھ کر نہ سناتا، اور نہ ہی اس سے آگاہ کرتا (اور) میں اس سے پہلے ایک طویل عمر تمہارے درمیان رہ (کر گزار) چکا ہوں تو کیا تم غور نہیں کرتے"؟

(یونس:۱۶) نیز دیکھئے (العمران: ۱۰۱ والحجرٰت:۷)

ان آیات میں خاص طور پر مخاطبین کو بتایا جارہا ہے کہ تمہارے درمیان تمہارا رسول بنفس نفیس موجود ہے۔ رسول کریم بچپن کے علاوہ تقریباً نصف صدی اُن لوگوں کے ساتھ رہ کر زندگی گزار چکے تھے، اس دوران قرآن کریم کا کیا کوئی ایک جملہ بھی ایسا دکھایا جا سکتا ہے جو حاضرین کے سوا مستقبل پر دلالت کرتا ہو؟ اگر نہیں تو پھر ایسی صورت میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے تمام خطابات جن میں نام بنام صرف حاضرین کو ہی "یا" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہو تو پھر وہ کلام کیونکر جزیرۃ العرب کے باہر اور بعد کے لوگوں پر منطبق ہو سکتا ہے؟

چنانچہ لَکُمْ تمہارے لئے، مِنْکُم تم سے، فِیْکُمْ تم میں، کُنْتُمْ صرف تم، اَنْتُم تم سب مرد اور اَنْفُسُکُمْ تمہاری جانیں، یہ سب اُس وقت کے صحابہ کرام سے یا آپ کے ہمعصر لوگوں سے متعلق ہی ہیں جن میں کافر اور مومن سب ہی شامل تھے۔

دیکھئے یہ جو فرمایا گیا ہے: یسئلُکَ النّاسُ عَنِ السّاعَۃِ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں (الاحزاب:۶۳) تو یہاں "ناس" سے کیا ہم یہ سمجھتے ہیں؟ یہ سوال رسول خدا سے اُس وقت کے تمام بنی نوع انساں نے کیا تھا؟ اور اُن لوگوں نے بھی جو اُس وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کریم کا ہر ہر جملہ، رسول خدا کے بعد اب بذاتِ خود ہم سب سے براہ راست مخاطب ہے۔ خواہ ہم اس کی زبان سمجھ رہے ہوں یا نہ سمجھ رہے ہوں، یہ کیسی مہمل بات ہے جو یہ لوگ قرآن کریم جیسی کتاب کے بارے میں بے خوف کہہ دیتے ہیں۔

قرآن کے بارے میں یہ بنیادی بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اس کا اندازِ بیان تقریری ہے، اور اس کی بیشتر باتیں موقع محل کے مطابق بالمشافہہ کی گئی ہیں جن میں حالات کے یکسر بدل جانے یا نئے حالات کے تحت اکثر تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہتی تھیں جنہیں آپ کی وفات کے بعد بڑی احتیاط کے ساتھ جمع تو کر لیا گیا تھا، مگر بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کی ترتیب آپ کی زندگی میں مستقل تصنیف کی جیسی حیثیت اختیار نہ کر سکی۔ رسول اللہ کے بعد اس کی بڑی وجہ کسی ایسے صاحب اختیار شخص کا نہ ہونا تھا جو الہامی جملوں کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے تصنیفی تقاضوں کے تحت کوئی ردّ و بدل یا ناسخ و منسوخ کا لحاظ رکھتے ہوئے ضروری کانٹ چھانٹ بھی کر سکتا۔ جس کی وجہ سے یہ اب اکثر جگہ محض اصل متن کے جملوں کا ایک بے ترتیب خزانہ ہے، جس میں سے ہر ایک دوسرے سے متضاد عقائد و نظریات رکھنے والا شخص اپنے اپنے مطلب کی چند غیر مربوط اور غیر مسلسل آیات پیش کر کے خود کو حق بجانب ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، یا بظاہر ایسا نظر آنے لگتا ہے۔ اسی لئے خواہ فلسفہ و سائنس کے مسائل ہوں، شریعت و طریقت کے مسائل ہوں، روح اور مادّے کے مسائل ہوں، تبلیغ و جہاد کے ہوں، جبر و قدر کے مسائل ہوں، یا پھر مختلف فقہ کے مسائل ہوں۔ یہ سب اسی ایک قرآن سے ہر فریق اپنے اپنے حق میں دعوائے نصوص کے ساتھ ثابت کر دکھاتا ہے، اور اپنے تئیں مطمئن ہو جاتا ہے، جس سے اسلام میں مختلف فرقوں نے جنم لے لیا، مگر مناسب لوگوں نے ان کے درمیان تطبیق قائم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ جس کا تدارک صرف رسول کریم کی حیات طیبہ میں قرآن کے اِعراب و اِملاء کی درستگی کے ساتھ جمع القرآن کی آخری اور حتمی ترتیب و کتابت پر ہی موقوف تھا۔ لیکن یہ کام ہماری بد قسمتی سے آپ کی زندگی میں سرانجام نہ پا سکا اور باقی ماندہ تمام اصل مخطوطات کو نقل کے بعد سیاسی مصلحتوں کی نذر کر دیا گیا، جس کی وجہ سے بعد

میں آنے والوں کو موجودہ ترتیب کو ہی مختلف طریقوں سے عہد نبوت کی ترتیب ثابت کرنے پر زور دینا پڑا۔ جس حقیقت کو اب ہم قرآن کریم سے اپنی بے حد عقیدت اور احترام کی وجہ سے کھلے دل سے قبول کرنے کو تیار نہیں ہو پاتے[2]۔

ان تمام باتوں کے بعد اب ہم اگر دوبارہ اپنی آسمانی کتابوں میں استعمال ہونے والے لفظ قوم کی طرف آئیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ قوم کے معنی میں اسلام کے ابتدائی دنوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی جس کی بڑی وجہ خوش قسمتی سے جزیرۃ العرب کے ایک ہی نسل کے لوگوں پر مشتمل ہونا تھی، جس سے قوم کے معنی خاندان یا قبیلے سے بدل کر آبائی مذہب اختیار کرنے والی پوری وطن کی آبادی پر منطبق ہونے لگے، (جن میں کچھ غیر عرب مسلم موالی بھی شامل کر لئے گئے تھے) جس کے بعد جزیرۃ العرب میں دارالسّلام کو ایک خاص حیثیت عطا کر دی گئی جو جزیہ و خراج اور غلامی سے یکسر پاک تھی جو اس نئے قومی شعور اور وطن سے محبت کی غماز تھی۔ اور وطن سے باہر کی تمام مفتوحہ غیر مسلم آبادی کو جزیہ گذار یعنی ذمّی اور ان علاقوں کو خراجی علاقے قرار دے دیا گیا۔ جس سے قومی حکومت اور رعایا کے درمیان دوہرا معیار قائم ہوا، اور آزاد دارالسلام اور مفتوحہ علاقوں میں دو الگ الگ نظام عدل قائم ہوئے جس کی بنیاد محض مشترکہ مذہب کے بجائے قوم اور مشترکہ آبائی مذہب اور وطن پر تھی۔ اس بات کو یوں سمجھنا آسان ہو گا کہ "اس کے بجائے اگر دارالسلام اور مفتوحہ دونوں علاقوں میں یکساں مذہبی آزادی اور جزیہ، زکوٰۃ، خراج، عشر اور ذمّی بنائے جانے کا نظام رائج کیا جاتا" تو ہم اُسے قومی حکومت کے بجائے ایک آزاد اور قرآنی عدل پر مبنی کسی "انقلابی اقتصادی نظام حکومت" کا نام دے سکتے تھے جیسا کہ اسلام کی نمونہ حکومت کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے[3]۔

2- دیکھئے میرا مضمون، جمع القرآن اور اس کی حفاظت کا مسئلہ، ص ۱۴۵

3- دیکھئے "اسلامی اقتصادیات کا جائزہ" زیر عنوان، انطباق، ص ۴۰۔۴۱، از علامہ شہید باقر الصدر (ایران)

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

تبلیغِ اسلام کی پالیسی

(اور اسلام کا پورا فریم ورک)

تبلیغ کے معنی پہنچانے کے ہیں اور بلیغ کے معنی حسبِ حال گفتگو کرنا، گویا تبلیغ دین کے معنی یہ ہوئے کہ نہایت دل نشیں انداز میں کسی سے دین کے بارے میں حسبِ حال گفتگو کر کے اپنا یا کسی اور کا کوئی پیغام اُس تک پہنچانا۔ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کام کے لئے منتخب کیا تھا، اس لئے آپ سے فرمایا گیا "بلّغ ما اُنزلَ الیکَ (۵:۶۷) پہنچا دیجئے جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ یقیناً جب کوئی پیغام کسی کو پہنچانے کے لئے دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اُسے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ پیغام کس کے لئے دیا گیا ہے۔ اس تشریح کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں اُس پیغام کو پڑھ کر یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں معلوم ہوتا کہ یہ پیغام کن لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ آپ پورے قرآن کریم کو بغور پڑھ لیجئے آپ کو اس کے مخاطبین میں سوائے اولادِ ابراہیم کے کسی اور کا کوئی ذکر اجمالاً بھی نہیں ملے گا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تبلیغ اسلام کے لئے کچھ بنیادی اصول مقرّر کئے تھے۔ مثلاً شروع میں آپ کے اپنے قبیلے والوں کے لئے فرمایا گیا تھا، " (اے پیغمبر آپ) انہیں اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ بلایئے " (نحل:۱۲۵) پھر فرمایا، "اللہ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ آپ ان کے لئے نہایت رحم دل واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ (ان کے حق میں) تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس آپ انہیں (جنگِ اُحد کے شکست خوردہ لوگوں کو) معاف کر دیجئے، ان کے لئے بخشش مانگئے اور (آئندہ) اپنے کاموں میں ان سے مشورہ بھی کر لیا کریں"... (اٰل عمران:۱۵۹) کفار عرب کی تبلیغ میں وقتاً فوقتاً موقع محل اور گروہوں کی درجہ بندی کے مطابق نرمی اور سختی

بھی کی جاتی رہی۔

تبلیغ کی ان تمام کوششوں میں صلہ رحمی کا ایک خاص اثر ہمیشہ غالب رہا، جس کے تحت آپ ہمیشہ اپنے قبیلے سے رابطے میں رہے اور باہمی گفت وشنید جاری رہی جن کی یہ آیات غماز ہیں جن میں کہا گیا"(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہئے) میں تم سے اپنے لئے تو کچھ نہیں مانگ رہا ہوں سوائے اس کے کہ ہمارے درمیان رشتے ناطے قائم رہیں" (۴۲:۲۳) یا فرمایا گیا، (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو میں تم سے جو مانگتا ہوں وہ تو تمہارے لئے (تمہاری اپنی بھلائی) ہے"(سبا:۴۷)

ابتدائی تبلیغ اسلام کی پالیسی کو سمجھنے کے لئے، آسانی کی خاطر ہمیں کچھ خطوط کھینچنے ہوں گے، جن کا تعلق کچھ تو جغرافیہ سے ہے اور کچھ کا مختلف عرب قبیلوں کی سیاسی اور مذہبی تقسیم سے، جو کچھ اس طرح ہے:

1. قریش مکہ اور حدودِ عرب میں مقیم دیگر عرب قبائل۔
2. حدودِ عرب میں مقیم مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے غیر عرب لوگ جو عموماً یہودی یا کچھ عیسائی بھی تھے۔
3. حدودِ عرب سے باہر مسلمانوں کے لئے غیر جانبدار یا معاہد عرب قبیلے۔
4. حدودِ عرب سے ملحق روم اور فارس کے باجگزار عرب قبیلے جن میں بیشتر عیسائی تھے جو عموماً اپنے مفاد کی خاطر اپنی وفاداریاں بدلتے بھی رہتے تھے۔
5. اور پانچویں، خود قیصر و کسریٰ کی حکومتیں۔ جن سے عرب آبادی کے تمام علاقے خالی کرا کے وہاں کے وسائل کو عربوں کے تصرف میں لانا تھا۔

ان سب کے لئے تبلیغِ اسلام کی پالیسی میں وقت کے ساتھ ساتھ کہیں انتہائی نرمی اور کہیں انتہائی سختی پائی جاتی تھی۔ جس کا معیار قریبی رشتہ داری اور عرب اور غیر عرب ہونے پر مبنی تھا۔ اس کے ثبوت کسی دوسری جگہ قرآن کریم کی آیات سے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ تبلیغ میں ذاتی طور پر اور قرآن کریم کے ذریعہ کن کن افراد اور گروہوں کو نام بنام مخاطب فرمایا۔ جس کی بناء پر یہ بات یقین کے

ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آپ کے ایسے دونوں خطاب کسی طرح بھی ہمہ گیر یا ایک ساتھ عرب و عجم کے لئے عام نہیں کہے جاسکتے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، "اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر جب یہ آیت "وانذر عشیرتک الاقربین" (الشعراء:۲۱۴) نازل فرمائی تو آپ نے (پہلے یاآلَ فہر کہہ کر تمام اولادِ فہر کو جمع کیا پھر ایک ایک کو واپس کرتے کرتے صرف الِ عبد مناف کو مخاطب کرکے) فرمایا "اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے (اُس وقت تک) نہ کسی (دنیاوی مال کے) حصّے کا مالک بنا سکتا ہوں نہ آخرت سے کوئی بہرہ دلا سکتا ہوں بجز اس صورت کے کہ تم کہو، "لاالہ الّااللہ" اس صورت میں میں، پروردگار کے روبرو، تمہارے حق میں شہادت دوں گا۔ (جس کے نتیجہ میں) تمام عرب تمہارا ہی دین اختیار کرے گا، اور تمہارے ہی طریقہ کی پیروی کرے گا، اس کہنے سے تمام عجم ذلیل ہو کر تمہارا تابع و مطیع ہو جائے گا[1]۔

"وتدین لکُم بھا العرب وتذلّ لکم بھا العجم"

آپ ﷺ کی اس تقریر میں اسلام کا پورا" فریم ورک "موجود ہے۔ اور حضرت ابن عباس کی اس روایت سے عرب سے اُٹھنے والی اس قومی تحریک کے عجم پر آئندہ کیا اثرات پڑنے والے تھے، اس کی بھی پوری پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آپ کی اس تقریر میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "اور عرب کے سوا دنیا کی اکثر عجمی قومیں بھی تمہارا ہی دین قبول کرکے ہماری آبائی ملّت میں شامل ہو جائیں گی۔" اس کی مزید وضاحت حضرت خالد بن سعد ان کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں "رسول اللہ نے فرمایا: میں تم لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں اگر (تم) مجھ کو نہ مانے تو (پھر پورے) عرب کی طرف، وہ بھی مجھے نہ مانیں تو (صرف) قریش کی طرف اور اگر وہ بھی نہ مانیں تو (صرف) بنی ہاشم کی طرف اور اگر یہ بھی نہ مانیں تو (میں) اپنی ہی طرف (تبلیغ کروں گا)[2]"

یہاں بھی اہلِ عجم کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس روایت سے آپ ﷺ کے ذہن میں اپنی

1- طبقات ابن سعد، حصّہ اوّل ص، ۱۱۱۔ ۱۱۲

2- طبقات ابن سعد، حصّہ اوّل، ص ۲۹۰، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

بعثت کے مقاصد کا جو خاکہ تھا اُس کی واضح نشان دہی ہو جاتی ہے۔ جبکہ اسکے بر عکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے جب آنحضرت حج کے زمانے میں عرب قبائل سے ملتے تھے تو فرماتے تھے کہ "اے لوگو 'لا الہ الا اللہ' کہو تو فلاح پاؤ گے۔ اس کی بدولت عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارے فرماں بردار ہو جائیں گے اور جب تم ایمان لاؤ گے تو جنت میں بادشاہ ہو جاؤ گے[3]۔"

نبوت کے ابتدائی زمانے میں آنحضرت ﷺ نے قریش کے سامنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا" قافلے کا چارہ جُو اپنے ساتھیوں کو جھوٹی خبر کبھی نہیں دیتا، خدا کی قسم (اگر) میں سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار ہو جاتا تب بھی تم سے خلافِ واقعہ بات نہ کرتا اور سب لوگوں کو دھوکا دینے پر آمادہ ہوتا تو تم کو ہرگز دھوکے میں نہ ڈالتا اُس خدا کی قسم جو وحدہٗ لاشریک ہے کہ میں تمہاری (یعنی اِلِ فہر کی) طرف خصوصاً اور باقی (عرب) لوگوں کی طرف (عمومی طور پر) پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں[4]"اس خطبہ میں بھی تبلیغ کا دائرہ، جزیرۃ العرب تک ہی محدود نظر آتا ہے۔

قریش کے علاوہ اُس وقت مکہ اور اس کے گرد و نواح میں کچھ عرب قبائل، یا تو عیسائی ہو گئے تھے، یا پھر عیسائیت کی طرف مائل نظر آتے تھے، یہ اہلِ کتاب کے زیر اثر تھے۔ سورۃ الاعراف کی آیات ۱۵۷ اور ۱۵۸، میں انہیں ہی متوجہ کیا گیا ہے جس میں فرمایا "وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں نبی امّی کی، جسے وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔ وہ انہیں حکم دیتا ہے بھلائی کا اور روکتا ہے برائی سے.... آپ ان سے کہہ دیجئے "قُل یا ایّھا النّاسُ اِنّی رسُول اللہ اِلیکُم جمیعا.... "اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" اس آیت کریمہ سے اُن تمام لوگوں کی نشاندہی ہو جاتی ہے جو اُس وقت اہلِ کتاب کے زیر اثر تھے جنہیں قرآن کریم نے اپنا مخاطب بنانا چاہا تھا۔ اور اگر "جمیعا" سے مراد غیر عرب دنیا بھی ہوتی تو اس میں اُمّیین اور تورات و انجیل کی تخصیص نہ پائی جاتی بلکہ کہا جاتا کہ،" یہ نبی، میری اس دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کو "یامُرھُم "حکم دیتا ہے۔

یہ ایک تبدیلی تھی قوم کے مفہوم میں کیونکہ پہلے آپ کو صرف اپنی قوم یعنی اِلِ فہر اور

3- ایضاً ص ۳۱۶

4-خطباتِ نبوی، ص ۵۱، مرتبہ جناب عبدالقیوم ندوی، مطبوعہ تاج کمپنی

قریبی رشتہ داروں کو ہی ڈرانے کا حکم دیا گیا تھا۔ ترجموں اور تفسیروں میں اس آیت کے سیاق و سباق سے جدا کر کے "جمیعا" کے معنی تمام بنی نوع انسان لے لینا، تحریفِ معنوی پر ہی محمول کئے جاسکتے ہیں "یحرّفونَ الکَلِمَ عَن مَّوَاضِعِہ" خدا کے کلمات کے اصل مفہوم کو اُس کی جگہ سے بدل دیتے ہیں" (النساء :۴۶) اس کی وضاحت ایک دوسرے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت ابوداؤد، حضرت عمر اور حضرت ابو بکر صدیق کے درمیان کسی رنجش کے پیدا ہو جانے کے قصّہ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کیا تم میری وجہ سے میرے ساتھی (کی ایذاء رسانی) کو چھوڑ دو گے۔ اے لوگو! (جب) میں نے کہا "میں تم سب کی طرف" بھیجا ہوا رسول ہوں، تو تم نے کہا کہ تو (نعوذ باللہ) جھوٹا ہے، اور ابو بکر نے کہا کہ تم سچّے ہو "یہاں بھی "تم سب کی طرف" کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ جن تک آپ کا پیغام اس واقعہ سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ اور جنہوں نے انہیں جھوٹا ٹھہرایا تھا۔

"ابوداؤد در قصّہ مغاضبہ حضرت صدیق و فاروق روایت می کند:

"قالَ رسول اللہ ﷺ "ھل انتم تارکون لی صاحبی انّی قلتُ: یا ایّھا الناس انّی رسول اللہ الیکُم جمیعا' فقلتھم کذّبت و قال ابو بکر صدّقت"

(ازالۃ الخفاء، جلد سوم ص ۶۸، اور یہی واقعہ اسی جلد کے ص ۱۵۹ پر بھی نقل ہے۔)

(یاد رہے کہ اس وقت عرب اور غیر عرب دنیا کے یہودیوں و نصاریٰ نے آپ کو جھوٹا نہیں کہا تھا اس لئے کہ وہ لوگ قومی نبوت کے سوا کسی اور نبوت، یعنی کسی ملک گیر نبوت سے اُس وقت تک واقف ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جب اُن سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تو اُنہوں نے اصولاً اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔)

اس واقعہ سے آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ جس وقت آپ نے قرآن کا یہ مشہور جملہ اپنے مخاطبوں سے کہا تھا "قُل یا ایّھا النّاسُ اِنّی رسُول اللہ اِلیکُم جَمِیعًا" کہ میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں" تو اُن سب مخاطبوں نے مل کر کہہ دیا تھا کہ (نعوذ باللہ) آپ جھوٹے ہیں۔ تو اُس وقت آپ کے سامنے نہ تو عجم موجود تھا اور نہ ہی عجمی مخاطب، اور نہ ہی اُنہوں نے دور بیٹھے ہوئے بلاوجہ کوئی تکذیب کی تھی۔

چنانچہ اُس وقت آپ کو جھوٹا کہنے والے اور تصدیق کرنے والے صرف وہی تمام لوگ اِس آیت میں النّاس اور جمیعا کے، بلا شرکت غیرے، مخاطب تھے، غیر عرب دنیا کے لوگ نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود ہی قرآن کریم کے اِس جملے کے مخاطبوں کی نشان دہی فرمادی تھی۔ دوسرے حضرت خالد بن سعدان والی حدیث بھی اُن لوگوں کی نشان دہی کر رہی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تم لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں، اگر قریش اِلِ فہر یا کُل عرب، اور بنی ہاشم نے بھی مجھے قبول نہ کیا تو میں اپنی طرف ہی تبلیغ کروں گا۔ یہاں آپ یہ بھی فرماسکتے تھے کہ "اگر تم سب نے مجھے قبول نہیں کیا تو پھر میں مجبوراً اہلِ عجم کی طرف نکل جاؤں گا اور اپنے خدا کا حکم بجالاؤں گا" یا پھر صرف اتنا ہی فرما دیتے کہ میں پوری دنیا کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ صرف اتنا ہی فرما دینے سے آپ تمام عرب، اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ، قریش اِلِ فہر، اور بنی ہاشم سب کی طرف مبعوث ہونے والے نبی سمجھ لئے جاتے۔ سب کو نام بنام مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور صرف یہ ایک جملہ ہی اِس تمام تحریف معنوی سے کہیں زیادہ منصوص سمجھا جاتا۔ کیونکہ قرآن کی فصاحت اس جیسے سادہ اور صاف جملے کے ادا کرنے سے عاجز نہیں تھی۔ اس لئے رسول خدا نے جہاں جہاں بھی یاایّھا النّاس فرمایا ہے اس کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ "اے ملتِ ابراہیم کے لوگو! یا پھر اے میرے ہم وطنو! ایک جگہ "النّاس" سے مراد عجم کے لوگ بھی لئے گئے ہیں، لیکن دعوتِ اسلام کے سلسلے میں نہیں بلکہ عربوں کا دشمن ظاہر کرنے کے لئے۔ جیسا کہ مدنی سورہ انفال:۲۶، کی تفسیر "النّاس" کے بارے میں ابو شیخ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ سے قولہ تعالیٰ:

"وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ"

اور یاد کرو جب تم زمین میں تھوڑے تھے، کمزور سمجھے جاتے تھے تم ڈرتے تھے کہ اُچک کر لے جائیں گے لوگ (تم کو)

کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ! "النّاس" کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "اہلِ فارس[5]"

5- الاتقان، حصّہ دوم، ص۴۷۸، از علامہ جلالدین سیوطی

اس تمام گفتگو اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت صرف قوم کے اُس نئے اور وسیع معنوں کے تحت ہوئی تھی جو خاندان اور قبیلے سے بدل کر صرف کسی ایسی جگہ کے لئے ہی تھی جہاں کی بیشتر آبادی کسی ایک ہی نسل کے لوگوں پر مشتمل تھی، اور حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کے ناتے وہ سب کے سب اپنا آبائی دین قبول کرنے کے پابند بھی تھے۔

Jurat-e-Tehqiq

بنی آدم کون لوگ ہیں؟

سامیوں کی الہامی کتابوں میں ایک شخص 'آدم' کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو بائبل کی رو سے دراصل سامیوں کے اپنے جد امجد کا نام تھا۔ اور بنی آدم سے مراد بھی صرف اُس ایک آدم کی ذرّیت ہی سمجھی جاتی تھی جو آدم نامی کوئی شخص دراصل سامی النسل لوگوں کا جَدِّ اعلیٰ تھا جس کی ذرّیت کا شجرۂ نسب بائبل میں دے دیا گیا تھا۔ جن سے مخاطب ہو کر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "هُوَ الَّذِی خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ" وہی ہے جس نے تم کو نفسِ واحد سے پیدا کیا"(الاعراف:۱۸۹) لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد اب اکثر غیر قوموں کے لوگ بھی ایک عمومی غلطی سے بائبل کی نظریاتی اور تصوراتی تخلیق کو ہی سامیوں اور غیر سامیوں کا مشترکہ جدِّ امجد سمجھنے لگے ہیں۔

بائبل کی رو سے انسان کی نظریاتی اور تصوراتی تخلیقِ اوّل کا مقصد زمین کی کاشت بتایا گیا ہے جو زمین پر اس سے پہلے کوئی دوسرا کرنے والا نہیں تھا۔(پیدائش ۲: ۵) جسے زمین کی مٹی سے ہی بنایا گیا تھا۔ اور ایک باغ جس کا نام عدن تھا اُس میں رکھا گیا تھا، قرآن کریم میں اُس باغ کا نام جنّت(۲:۳۵) بتایا گیا ہے، جس میں اعمال صالح کے ذریعہ ایک نہ ایک دن پھر تمام اولادِ آدم کو واپس جانا ہے۔

قرآن نے اپنے مخاطبین کو آدم کے کئی نام بتائے ہیں مثلاً کہیں بشر(۱۵:۲۸) کہیں خلیفہ(۲:۳۰) اور کہیں(کتاب پیدائش کی رو سے) آدم(۲:۳۱) اور اس کی تخلیق کا مقصد عبادت کرنا بتایا گیا ہے۔ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ(۵۱:۵۶)

کتاب پیدائش کی تدوین کے وقت، جو حضرت موسیٰ کی وفات کے کئی سو سال بعد مرتّب

کی گئی تھی، اولادِ آدم کی اتباع میں دوسرے لوگوں نے بھی بائبل کے اُس مخصوص آدم کو تمام نوع انسانی کا جدامجد سمجھ لیا جو ارتقاءِ انسانی کے لاکھوں سال بعد پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا اب اکثر دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اُسی آدم کو اپنا جدِامجد تسلیم کر کے اپنے نسب نامے سامیوں کے ساتھ جاملائے، جن سے اُن کا کوئی صلبی رشتہ نہیں تھا۔ قرآن کریم میں اُس نفسِ واحدہ کا مطلب یہی تھا کہ "اے الکتاب میں مندرج اولادِ آدم کے سلسلہ انبیاء کی اولادو! میں وہی خدا ہوں جس نے تم سب کو ایک ہی شخص یعنی تمہارے جدِامجد آدم صفی اللہ کے صلب سے پیدا کیا ہے"۔ عموماً لوگ اب اسی آدم کو انسان کی تخلیقِ اوّل سمجھنے لگے ہیں، جس سے نظریاتی تخلیقِ انسان اور سامیوں کے حقیقی جدِامجد، جو نظریاتی تخلیق اور حقیقی ارتقاء کے دو الگ الگ انسان تھے مل کر ایک سمجھے جانے لگے۔ اس طرح مذہب اور سائنس میں آپس کا ٹکراؤ بھی نظر آنے لگا۔ جو اغلب ہے کہ ایک تاریخی غلطی تھی جو کتاب پیدائش کی تدوین کے وقت ناموں کی یکسانیت کی بنا پر سرزد ہوئی۔

ذرّیتِ آدم کی میثاق جس کا تعلق صرف اولادِ آدم سے ہی تھا جس میں فرمایا گیا:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا (الاعراف:۱۷۲)

(اور اے پیغمبر اِن لوگوں کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے اُن کی نسلوں کو باہر نکالا اور اُن کے مقابلے میں خود اُنہی کو گواہ بنایا اور پوچھا، کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے کہا کہ ہاں ہم (اس بات کے) گواہ ہیں۔

یہ بے تکا سا عہد صرف سامیوں کے جدِامجد حضرت آدم کی اولاد سے ہی لیا گیا تھا، جو اُن کی کتابوں میں اب بھی لکھا ہوا موجود ہے۔ ایسا عہد ان کے علاوہ کسی اور قوموں کے افراد سے کبھی نہیں لیا گیا جو اُنہیں یاد بھی ہو۔ اس لئے دوسری قوموں کا کسی خاص شخص کو اپنا باپ سمجھنا بڑی شرم کی بات ہے اور اپنے حقیقی اجداد سے انکار کے مترادف ہے۔

سائنس کی رو سے سامیوں کے اصطلاحی آدم سے پہلے اس زمین پر سینکڑوں آدم (انسان) پیدا ہو چکے تھے، لیکن صرف بائبل اور قرآن کے آدم کو غلطی سے تخلیق اوّل سمجھ لینے سے سائنس اور مذہب کے درمیان ناقابلِ فہم تفاوُت پیدا ہو گیا۔ اس کا تعلق نظریہ الہام سے ہے، جسے قرآن وحی کہتا ہے۔ الہام دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تصوراتی الہام اور دوسرا حقیقی، حقیقی الہام کا تعلق منہاجِ نبوت سے تھا جو کہ انتخاب کے ذریعہ خالق کائنات کی طرف سے عطا کردہ ایک اصطلاحی وصف تھا جو صرف بنی آدم ہونے کے ناتے حضرت ابراہیم اور آپ کے خاندان کے لئے مخصوص تھا، جو اب اُن میں بھی باقی نہیں رہا ہے۔ جبکہ تصوراتی الہام کا تعلق کسی قسم کے اصطلاحی وصف سے نہیں۔ یہ کائناتی رازوں کو سمجھنے اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک انسان کی اپنی ذہنی کاوش ہوتی ہے جو کبھی کبھی صرف کسی جُزوی حقیقت کو ہی پا سکتی ہے۔ جس پر صرف سائنس ہی مہر صداقت لگا سکتی ہے۔ ہم اسے الہام صرف اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ذہن اور عقل بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے۔ بائبل کے ترجموں میں وحی و الہام کا لفظ صرف ایک یا دو مرتبہ ہی آیا ہے جس کے معنوں میں علمائے دینیات میں دو آراء پائی جاتی ہیں کہ الہام میں مصنف کا کردار کیا ہے۔ ایک میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ الہام میں انسان کا حصّہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ دیا گیا وہی بلا کم و بیش دوسروں تک پہنچا دے۔ (جے۔ آئی پیکر، نیو بائبل ڈکشنری، ص ۵۶۵)

دوسرے نقطۂ نگاہ کی رو سے مصنف کا اپنا تصور کائنات، تاریخی پس منظر اور علمی قابلیتیں سب اُس کی تصنیف میں موجود ہیں چنانچہ (تصنیف میں) جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ فقط خدا کا کلام ہے بلکہ اس میں انسانی الفاظ اور کارگزاری بھی پائی جاتی ہے۔ (قاموس الکتاب، ص ۷۸) یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی ہے کہ مسیحی نظریہ الہام، اسلام کے نظریہ سے مختلف ہے۔ (قاموس الکتاب، ص ۱۰۶۲)

خواجہ احمد الدین امرتسری کا بھی یہی خیال ہے کہ الہام دو قسم کے ہوتے ہیں آپ فرماتے ہیں:

"عام قدرتی الہام میں انسانی جذبات کا دخل ضروری ہے، لیکن تصرّف الٰہی کے تحت خاص طور پر ہونے والا الہام نہایت محفوظ، مکمل اور بے بدل ہوتا ہے"[1]

1- قرآن سے قرآن تک، ص ۵۳۳

ایسے ہی الہام کو قرآن کریم وحی کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ جبکہ الہامِ عام انسانی عقل سے ماوراء باتوں کو انسان کی ذاتی استعداد سے قیاس یا نظریے کی شکل میں جزوی اور مبہم رہنمائی ہی کرا سکتا ہے۔ اس لئے تخلیق اوّل کے تمام نظریے اسی الہام کے مظہر ہیں۔

اب رہی بات آدم کی، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ "فی کُلّ ارضٍ آدم مثل آدمکُم و نوح مثل نوحکُم الخ" یعنی تمام قوموں میں تمہارے آدم کی مثل آدم ہوئے ہیں اور تمہارے نوح کی مثل نوح[2]" جزیرہ سراندیپ (لنکا) کے باشندوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے باشندے (سامی) آدم کے زمانے سے کشتیوں کے ذریعہ مکہ معظمہ اور عرب کے دوسرے شہروں میں جایا کرتے تھے[3]۔ مصر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کسی مکان کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ مکان قبل از آدم ۲۵۰۰۰ (پچیس ہزار) سال سے بنا ہوا ہے[4] حضرت علی سے ہی کسی نے پوچھا تھا کہ آدم سے پہلے کون تھا؟ آپ نے فرمایا، آدم، اس نے پھر دریافت کیا، اُس سے پہلے کون تھا، فرمایا، آدم اور کہا کہ اگر تو ہزار بار بھی پوچھے گا تو میں یہی جواب دوں گا کہ آدم۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی آمد کے زمانے میں بھی عرب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ سامیوں کے جدِ امجد حضرت آدم انسان کی تخلیق اوّل نہیں ہیں اور اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ تورات اور قرآن کریم میں جہاں "بنی آدم" کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد، سامیوں کے آدم کی اولاد سے ہے۔ "انَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُم اُمَّۃً وَّاحِدۃً" بیشک یہ آپ کی اُمت (اور انبیاء سابقین کی اُمت) ایک ہی اُمت ہے" (المومنون:۵۲)

حضرت خواجہ احمد الدین امرتسری فرماتے ہیں کہ " آدم میں تمام بنی آدم شامل ہیں کیونکہ قصّہ آدم میں واحد، تثنیہ اور جمع تینوں قسم کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوّلین ماں اور باپ میں ان کی ساری نسل شامل ہے[5]" یہاں سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اللہ

2- مولانا عبید اللہ سندھی، ص ۸۶، پہلا ایڈیشن

3- تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۸۸۵ (اردو)

4- تاریخ کشمیر حصّہ دوم، ص ۷، نیز دیکھئے تاریخ شام، ص ۱۴۳، بائبل اور تخلیق عالم کی کہانیاں، از فلپ کے۔ حتی

5- قرآن سے قرآن تک۔ ص ۹۹، مرتبہ جناب عرشی صاحب

تعالیٰ نے قرآن میں یہ جو فرمایا کہ "بے شک اللہ نے چن لیا، آدم اور نوح اور اولادِ ابراہیم اور اولادِ عمران کے گھرانے کو عَلَی العٰلَمِینَ (تمام قوموں سے جدا کر کے) جو آپس میں ایک دوسرے کی اولاد تھے۔" (آل عمران:۳۳۔ ۳۴) جن کے اجداد کو چند ہزار سال پہلے کسی ارضی جنت یا باغ عدن میں پروان چڑھا کر لائق مسجودِ ملائک اور اس زمین کی خلافت سونپنے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا جنہیں قرآن میں یا بنی آدم کہہ کر پکارا گیا تھا۔ اب اگر وہ آدم تمام انسانوں کی تخلیق اوّل نہیں ہیں اور صرف سامی النسل لوگوں کے ہی جدِ اعلیٰ ہیں تو باقی جہان والے کس طرح آدم کی اولاد کہلائے جاسکتے ہیں؟ جبکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی تفصیل خود ہی بیان کی ہوئی ہے۔

چنانچہ آپ ذاتی طور پر غیروں کو بھیجے گئے سیاسی حکم ناموں کے علاوہ، (جن کا حکم قرآن میں کہیں درج نہیں) اندرون ملک دیئے گئے آپ کے زبانی خطبات، یا قرآن کریم کے ذریعہ جن لوگوں کو نام بنام مخاطب کیا گیا تھا ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1. اپنے قریب ترین خاندان کے لوگ (یعنی اٰل عبد مناف) (۲۶:۲۱۴)
2. جن کے باپ دادا پہلے نہیں ڈرائے گئے تھے (۳۶: ۶ اور ۳۲:۳)
3. مکہ اور اس کے گرد و نواح والوں کو ایک ساتھ (۶:۹۲ اور ۴۲:۷) (فرقان:۵۱)
4. عرب امّیین کو (۶۲:۲) یعنی تمام بنی اسمٰعیل کو۔
5. صرف عربی زبان بولنے والوں کو (۴۱:۳)
6. اور اہلِ کتاب، جن سے مراد (عرب میں رہنے والی) تمام اولادِ ابراہیم تھی۔

جنہیں قرآن کریم میں "جمیعا یا امة واحدة، ملّة ابیکُم ابراھیم اور "یا" کی اضافت کے ساتھ "یا ایّھا النّاس" اور ایک آدھ جگہ "یا ایّھا الانسانُ" (۸۲:۶) کہہ کر پکارا گیا تھا، "یا" حرف ندا ہے، اور ندا کے ذریعہ زندہ اور موجود کو ہی مخاطب کیا جاسکتا ہے، بعید ہو یا قریب، بعید اس حد تک کہ جہاں تک آواز پہنچ سکے۔

سورہ مزّمل، رسول کریم پر نازل ہونے والی تیسری سورت ہے جس میں آپ کی بعثت کو حضرت موسیٰ سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّآ اَرسَلنَا اِلیکُم رَسولاً شَاھِدًا عَلَیکُم کَما اَرسَلنَا اِلٰی فِرعَونَ رَسُولاً (المزمل:۱۵)

"بے شک ہم نے بھیجا رسول تمہاری طرف گواہی دینے والا تم پر جیسے ہم نے بھیجا فرعون کی طرف رسول"۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو بھی اپنی قوم کو فرعون سے صرف نجات دلانے کے لئے ہی بھیجا تھا۔ حضرت موسیٰ عالمگیر نبی نہیں تھے، اس لئے یہاں " کَما اَرسَلنَا" کی تشبیہ آپ کو حضرت موسیٰ کے مماثل ظاہر کرتی ہے، چنانچہ نہ حضرت موسیٰ کو تمام دنیا والوں کی طرف گواہ بنا کر بھیجا گیا تھا نہ آپ کو۔ کیونکہ قرآن کریم میں ایسی کوئی واضح آیت موجود ہی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہو کہ ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کی طرف رسول یا گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ البتہ صحابہ کرام کو دوسروں پر گواہ ضرور بنایا گیا تھا۔ اسی لئے قرآن کریم میں بار بار اُن لوگوں کی نشاندہی صاف صاف الفاظ میں کی جاتی رہی ہے جن کی طرف آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا، جنہیں منسوخ کرنے کے لئے ایسی ہی واضح آیات کا نازل کیا جانا ضروری تھا جو قرآن کریم میں ایک بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے کہ ایسی آیت کا نازل کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت ہی کے خلاف تھا، لہٰذا ایسی تمام آیات جن میں آپ کو صرف غیر اہلِ کتاب یعنی بنی اسمٰعیل اور ان کے کے علاوہ باقی اسی خاندان کے اہلِ کتاب کی طرف بھیجا جانا ظاہر کرتی ہیں غیر منسوخ اور محکم ہیں، جن کی موجودگی، آپ کے عالمگیر نبی ہونے میں مانع ہے جنہیں منسوخ یا بے اثر سمجھنے کا حق کسی صاحبِ ایمان کو نہیں پہنچتا۔ جن کا لحاظ ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے علماء، از راہِ عقیدہ یا تکلّفاً اس بات کا اعتراف کرتے وقت لفظ اوّل کا اضافہ کر کے فرماتے ہیں "در اصل قرآن کریم کے اوّل مخاطب تو عرب ہی تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر چاہا کہ عربوں کے ذریعہ اِن کے اس دین کو دنیا کی باقی غیر عرب قوموں کو بھی پہنچا دینا چاہئے[6]۔ جسے عربوں کو پہلے اس دلیل کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ یہ تمہارے اپنے ہی باپ ابراہیم کا دین ہے، مِلَّةَ اَبِیکُم ابرٰھِیمَ جس کا اطلاق بائبل کے آدم کی اولاد پر تو ہوتا تھا مگر نظریاتی قصّہ آدم کے الہام پر نہیں، جسے بعد میں بغیر کسی دلیل کے کہ 'اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا' کہہ کر اسلام قبول کرنے والے عجمیوں نے، بغیر حکم خداوندی، قرآن

6- دیکھئے مضمون، قرآن کریم کے اوّل مخاطب، کتاب ھٰذا ص ۳۵

کریم کو تمام دنیا سے مخاطب ظاہر کرنا شروع کر دیا انہوں نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا، اللہ ان کی مغفرت کرے، جسے ایک کے بعد ایک مبلغ اسی طرح اب تک دہراتا چلا آرہا ہے، جس میں اسلام قبول کرنے والوں کی اپنے اختیار کردہ دین سے خلوص اور عقیدت تو بے حد نظر آتی ہے مگر اس میں حقیقت ذرّہ برابر بھی نہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی یاایّھا الناس، یاایّھاالذین آمنوا، اور یابنی آدم کے ذیل میں لکھتے ہیں" (جن آیات میں) یاایّھاالناس، اور یابنی آدم، آیا ہے وہ مکی ہیں، اور جن میں یاایّھاالذین آمنوا، آیا ہے وہ بلا استثناء عموماً مدنی ہیں..... آپ فرماتے ہیں کہ "مگر علامہ مکی نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہ قاعدہ کثرت کی بناپر قائم ہے، نہ کہ عموم کے لحاظ سے ورنہ اکثر مکی سورتوں میں "یاایّھاالذین آمنوا" بھی وارد ہوا ہے۔

کسی اور شخص کا قول کہہ کر علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ اس بات کو یوں سمجھ لینا اسے قریب الفہم بنادے گا کہ "خطاب کے یہ کلمات ایسے ہیں جن سے عام طور پر "یا" (سے مراد) بالکل مکہ یا بالکل مدینہ ہی کے لوگ مقصود ہیں[7]۔"

مگر اس کے بعد پھر "یا" اور "یابنی آدم" کا اطلاق تمام غیر حاضر نوعِ انسان کے لئے کب اور کہاں سے شروع ہوا؟ علامہ سیوطی نے اس کا ذکر نہیں کیا[8]۔

اگر یہ خیال درست ہے کہ نظریاتی آدم تمام انسانوں کا اصل مورث اعلیٰ نہیں ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ قرآن کریم کے مخاطب بنی آدم تمام بنی نوع انسان نہیں ہیں۔ اس تمام مسئلے کا دارومدار اقسامِ وحی و الہام پر قائم ہے۔ ہمارے اپنے زمانے کے ایک جیّد عالم جناب علامہ جاوید احمد غامدی صاحب سے جب پوچھا گیا کہ دانش و دین یا عقل اور وحی میں کیا فرق ہے تو آپ نے فرمایا: "دانش اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی ہے۔ اگر اس (بات کو سمجھ کر اور پھر اس) کو مان لیا جائے تو تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اجتہاد اور فقہ سے اسلامی شریعت کا کوئی تعلق نہیں، اجتہاد وہاں سے شروع ہو گا جہاں شریعت ختم ہو جاتی

7- الاتقان، حصّہ اوّل، ص ۳۸

8- ایضاً، ص ۳۹، (اردو) ۲ قومی ڈائجسٹ لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء

ہے۔ جبکہ شریعت کی تعبیر ہوتی ہے"۔ اور میرا کام یہی ہے[8]۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ماورائے عقلِ انسانی، وحی کے ذریعہ کبھی ہماری کوئی مدد نہیں کی، چنانچہ ابتدائے آفرینش سے متعلق انسان کے جتنے بھی نظریات و تصورات ہیں وہ سب کے سب انسان کی اپنی ہی اُپج اور عقلی کاوشوں کے عبوری نتیجے ہیں، جنہیں ہم وحی دانش کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر پھر بھی وہ ایک وقتِ مقررّہ تک لاینحل ہی رہتے ہیں، یہاں تک کہ صفحاتِ ارضی کے عالم کسی نظریہ کی تصدیق نہ کر دیں۔

الہام، قوتِ متخیلہ یا وحی دانش، ایک ایسی قوت ہے جس میں مصنف، شاعر، مصوّر، رشی منی، محقق، اور عام کاریگر سب ہی شامل ہیں۔ البتہ ان میں تفاوت و درجے ہیں۔ جو لوگ ہمہ تن کسی کام میں مستغرق رہتے ہیں اُن کی قوت متخیلہ یہاں تک غلبہ پالیتی ہے کہ انہیں اپنے خیالات مجسم دکھائی دینے لگ جاتے ہیں اور تخیلات زبانِ حال سے بولنے لگ جاتے ہیں، لیکن وہ خیالات اور آوازیں ہاتف غیب کی طرف سے نہیں بلکہ وہ اُن کی اپنی ہی قوتِ متخیلہ کے عکس ہوتے ہیں[9]۔ خصوصاً ماورائے عقل و فہم جیسے معاملات میں۔ مثلاً خدا کیا ہے؟ حیات کا ابتدائی خلیہ تدریجاً منازل طے کرتا ہوا مختلف انواع میں سے کیسے تبدیل ہو کر انسان بن گیا؟ کائنات کا وجود کب اور کیونکر ہوا؟ روح کیا ہے؟ زمان، مکان میں کب اور کیسے پیوست ہو گیا؟ تخلیق کائنات سے پہلے زماں کا وجود تھا یا نہیں؟ یہ اور ان جیسے اور بھی بہت سے سوالات ہوسکتے ہیں جن کے جوابات انسان نے ابھی کتابِ فطرت میں تلاش کرنے ہیں۔ جبکہ بنی آدم کو خدا نے وحی کے ذریعہ کتاب و حکمت اور تائید کے ساتھ آباد زمینوں پر کئی بار فتح و نصرت عطا فرمائی، اور اکثر اُن زمینوں کے مالکوں اور اُن پر کام کرنے والے جفاکش انسانوں کا حاکم بھی بنایا۔ اور یہ اللہ کا اُن سے وعدہ تھا جو بے شک پورا ہوا۔

8- ایضاً، ص:۳۹، (اردو) ڈائجسٹ لاہور مارچ ۲۰۰۰ء
9 دیکھئے، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص۷۸۹۔۷۹۰، مرتبہ جناب مولوی محبوب عالم

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

كُنتُم خَيرَ أُمّـةٍ

عام طور پر خیر امت سے مراد تمام مسلم امّت بلا تفریق رنگ و نسل لی جاتی ہے، حالانکہ خیر امّت میں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی صحابہ کرام میں سے صرف چند لوگ ہی مراد تھے۔ جنہیں خیر امّت کا لقب عطا ہوا تھا، جیسا کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ "حق تعالیٰ کے قول "كُنتُم خير امّةٍ" کے بارے میں کہ یہ ہمارے زمانہ والوں (میں سے صرف چند) کے لئے ہے، (تمام مسلمانوں یا) آخری زمانہ والوں کے لئے نہیں، آپ نے فرمایا، "اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرماتا، "انتُم" تو پھر ہم کہہ سکتے تھے کہ " ہم سب " لیکن اللہ تعالیٰ نے (اس کی جگہ) فرمایا "كُنتُم" لہٰذا یہ اصحابِ محمد کے خواص سے متعلق ہے۔ مطلب یہ کہ "كُنتُم خير امّةٍ لِلناس" کے بجائے حق تعالیٰ اگر " أنتُم خير امّةٍ لِلنّاس" فرماتا تو پھر اس فرمانے سے تمام امّت مخاطب سمجھی جاتی[1]" اس لئے کہ أنتُم کے معنی "تم سب کے سب" ہوتے ہیں۔ (أنتُم کی ضمیر جمع مذکر کی ہے) جبکہ كُنتُم کے معنی (صرف) "تم " (مخاطبین) کے ہی ہیں، تم سب کے نہیں۔ اس قرآنی جملے سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ صرف آپ کے وہ خاص لوگ ہی باقی امت اور اپنے موجودہ ماحول کے لئے خیر کا درجہ رکھتے تھے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں " كُنتُم " کا لفظ تو سینکڑوں بار آیا ہے، جس سے مراد صرف اُس وقت کے خاص صحابہ کرام ہی تھے، ان کے بعد کے یا آج کل کے عام مسلمان نہیں تھے۔ مگر " أنتُم " کا لفظ خاص خاص جگہوں پر ہی آیا ہے جہاں اُن لوگوں کی تخصیص پہلے سے موجود ہو مثلاً "فلا تموتن الا و انتُم مسلمون" (البقرہ:۱۳۲) کا یہ جملہ حضرت ابراہیم نے

1- ازالۃ الخفاء، جلد دوم، ص ۳۱

اپنی تمام اولاد سے کہا تھا کہ "نہیں مرنا تم سب اے میری اولاد مگر مسلم رہ کر" دوسری جگہ یہی جملہ عرب کے اُن مومنین کیلئے بھی کہا گیا تھا کہ جن میں اُس وقت اُن کا رسول اُن کے درمیان موجود تھا:

"یا ایّھا الذینَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَاتَمُوتُنَّ اِلّاوَاَنتُم مُسلِمُونَ"

اے وہ لوگو جو ابھی تک ایمان لا چکے ہو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم سب ہرگز نہ مرنا (مگر اس حال میں) کہ تم مسلمان ہو (العمران:۱۰۲)

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ حاضر اور محدود لوگوں کو ہی اپنا مخاطب بنایا ہے۔ یا تو "یا ایّھا النّاس" کہہ کر یا "یا ایّھا الذینَ اٰمَنُوا" کہہ کر یا پھر "کُنتُم" اِن میں سب جگہ خاص طور پر صرف اُنہیں لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے، جو اُس وقت وہاں موجود تھے اور اپنے رسول سے براہ راست اللہ تعالیٰ کا فرمان سن رہے تھے۔ اس بنا پر قرآن کریم کے ایسے تمام خطابات کبھی بھی ہمہ گیر یا مستقبل کے لوگوں سے مخاطب نہیں سمجھے جا سکتے۔ اور اگر آپ ﷺ نے ذاتی طور پر کبھی صحابہ کرام سے یہ کہا بھی تھا کہ آپ لوگ میرا اِس وقت کا یہ پیغام اُن تک بھی پہنچا دو جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی نکلتا ہے کہ یہ بات بھی صرف اُنہیں صحابہ کرام سے کہی گئی تھی جو اُس وقت وہاں موجود تھے۔

جناب مولانا سعید احمد، ایم۔اے۔ اکبر آبادی، اٰل عمران کی آیت ۱۱۰، جس میں فرمایا گیا ہے "تم بہترین امّت ہو،" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں" اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ صحابہ کرام کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض مسلمانوں نے اجتماعی اور قومی حیثیت سے غالباً کبھی ادا نہیں کیا۔" (عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقدین، ص ۱۰۷) جہاں تک میرا ذاتی مطالعہ ہے میں اُس کی بنا پر اس حد تک ضرور کہہ سکتا ہوں کہ رسول کریم کے اُن صحابہ کرام نے بھی سوائے اہلِ وطن عربوں کے، تمام دنیا تک قرآن کریم کے کسی پیغام کو پہنچانا کبھی بھی اپنا فرض منصبی نہیں سمجھا، اس لئے کہ ایسا کوئی حکم اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول نے اُنہیں کبھی دیا ہی نہیں تھا کہ جس سے وہ غفلت برتنے کے مرتکب سمجھے جاتے۔ جہاں تک امر بالمعروف اور

نہی عنِ المنکر کا سوال ہے تو یہ کام آنحضرت کے زمانے میں مقامی طور پر کچھ اہلِ کتاب بھی کیا کرتے تھے جن کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تعریف کی ہے، جس میں فرمایا گیا:

"اہلِ کتاب میں سب برابر نہیں ہیں (ان میں) ایک امّت (سیدھی راہ پر) قائم ہے اور رات کے اوقات میں اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، وہ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور وہ اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور وہ (خود بھی) نیک کاموں کی طرف دوڑتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔" (ال عمران:۱۱۳۔۱۱۵)

ان آیات کریمہ میں ان خاص لوگوں کو اللہ کا کلام پڑھنے والا بتایا گیا ہے جس سے اُن کتابوں کی صحت اور سابقہ امت میں خیر امّت لوگوں کے موجود ہونے کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ اور خیر امّت ہونے پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہتی۔ اس لئے کہ ان آیات میں انہیں اہلِ کتاب امّت کہا گیا ہے، اس کے باوجود کہ وہ لوگ آپ پر ایمان نہیں لائے تھے، کیونکہ ان آیات میں صرف اللہ اور آخرت پر ہی ایمان رکھنے کا ذکر ہے۔ نیز دیکھئے آیات (۲:۶۲ اور ۵:۶۹) ایسے لوگ آج بھی اور امّتوں میں ہو سکتے ہیں جو مذہباً مسلم نہیں کہلاتے مگر لغوی اعتبار سے مسلم یعنی امن پسند اور مہذب ہیں۔

مسلمانوں میں بھی اچھے اور بُرے لوگ موجود ہیں اس لئے کسی بھی تمام کی تمام امت کو ہمیشہ کیلئے خیر امّت کا لقب نہیں دیا جا سکتا کہ جس سے کوئی امت اس حد تک مغرور اور خود سر ہو جائے کہ صرف خود کو ہی اکیلی خدائی فوجدار سمجھنے لگ جائے۔

آپ نے اپنی امّت کے چار مخصوص عیب بتائے تھے جن سے انہیں آسانی کے ساتھ پہچانا جا سکتا تھا۔ جن کا ذکر اس حدیث میں فرمایا گیا ہے جو ابو مالک الاشعری سے مروی ہے، آنحضرت نے فرمایا" میری امت میں یہ چار باتیں جاہلیت کی ہیں، جن سے یہ لوگ باز نہیں آتے:

1. اپنے خاندان پر فخر
2. دوسروں کے خاندان پر طعن

3. تیسرے ستاروں کے وسیلے سے پانی (یعنی بارش) مانگنا
4. چوتھا نوحہ کرنا[2]

اس لئے آپ کی امت کا دور جاہلیت سے تعلق ہونا بھی ثابت ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن کریم میں دین کے لئے امّت کا لفظ بھی اولاد ابراہیم کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس لئے بولا گیا ہے کہ ان کے یہ تینوں مذاہب خاندانی اعتبار سے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، لیکن اسلام سے پہلے دونوں مذاہب کے ماننے والوں نے اس دعوت کو قبول کر کے اسلام میں ضم ہونا اور اپنی علیحدہ مذہبی اور سیاسی حیثیت کو ختم کر کے عرب کی اُس قومی مملکت کے زیر سایہ آنا پسند نہیں کیا کیونکہ کسی نبی کی زندگی میں اُس پر ایمان لانے سے دوسری قوم کے بادشاہوں اور سرداروں کو اپنی موجودہ عظمت و شوکت کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا، اور اپنے تمام لائحہ عمل اور دستوری معاملات سے دست بردار ہو کر ہر صورت میں انہیں اُس نبی کا مطیع و فرمابردار بن کر ہی رہنا پڑتا ہے جس سے بحیثیت قوم اُن کی اپنی علیحدہ خودی کی نفی ہو جاتی ہے۔ البتہ نبی کی وفات کے بعد عوامی مذہب بادشاہ وقت کی قوّت و مقبولیت میں بہت اضافہ کر دیتا ہے۔

قرآن کریم نے مذہب کی بنا پر جو انہیں "إِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" (الانبیاء:۹۲) کا نام دیا تھا، کہ یہ تمہاری امت دین کے لحاظ سے بھی ایک ہی ہے۔ اس لئے امّتِ واحدہ ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اُن کا پہلے سے کسی ایک دین پر مشترک اور متفق ہونا ضروری ہے۔ مگر اس سے سیاسی اور قومی اتحاد پھر بھی ممکن نہیں ہو سکا جیسی کہ اُس وقت عرب کے ہمسایہ ملکوں اور قوموں کی حالت تھی۔ اسی لئے اُن لوگوں نے دینِ اسلام قبول کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی، بجز اندرونِ عرب اتحاد کے کہ وہ سب کے سب ایک ہی قوم کے افراد تھے جس کے بعد نبوت کی برکت سے بلا شرکتِ غیرے ان کی یعنی قریش کی اپنی قومی حکومت وجود میں آگئی۔

2- بحوالہ، انتخابِ حدیث، ص ۱۱۱، از جناب مولانا محمد جعفر شاہ ندوی پھلواروی

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

قرآن کریم کا عملِ تنسیخ

احکامات کے سلسلے میں قرآن کریم میں چار قسم کی آیات نازل ہو گئی تھیں، جن میں تین منسوخ اور ایک قسم غیر منسوخ قرار پائی۔ ان غیر منسوخ آیات کی شرح کے کئی طریقے ہیں۔

جناب غلام احمد حریری فرماتے ہیں:

"قرآن حکیم میں جو آیات مجمل یا مشکل ہیں حدیث ان کی توضیح کرتی ہے، جو آیات عام ہیں حدیث ان کی تخصیص کرتی ہے، اور جو مطلق ہیں ان کو مقید کرتی ہے۔" (تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۵۶)

جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ازالۃ الخفاء کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"قرآن کریم کا کچھ حصہ منسوخ ہو گیا ہے۔ تنسیخ تین قسم کا ہوا ہے:

1. ایک یہ کہ تلاوت بھی منسوخ اور حکم بھی منسوخ
2. دوسرے یہ کہ صرف تلاوت منسوخ (حکم باقی) (ان دونوں قسم کی تنسیخ سے قرآن کریم کا تقریباً دو تہائی سے کچھ کم حصہ حیاتِ نبوی تک پہلے ہی منسوخ ہو گیا تھا)
3. تیسرے یہ کہ صرف حکم منسوخ (تلاوت باقی)

پہلی اور دوسری قسم (موجودہ) قرآن کے اندر لکھی نہیں گئیں، جس حصۂ قرآن کی حفاظت نہیں کی گئی اس سے منسوخ کی یہی دونوں قسمیں مراد ہیں[1]۔

تیسرا منسوخ حصّہ وہ ہے جس کی تلاوت تو کی جاتی ہے مگر اس کے حکم ہونے میں صحابہ کرام کے بعد سے اختلاف پایا جاتا ہے، آپ ﷺ کے زمانے اور صحابہ کے زمانے میں اِس کے

1- ازالۃ الخفاء، جلد اول، ص ۹۷

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

منسوخ ہونے میں عموماً کوئی اختلاف نہیں تھا۔ آپ کے بعد اس کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے میں بڑی بڑی تاویلیں پیش کی جاتی ہیں۔[2]

جو حصّہ متفقہ طور پر منسوخ تھا یعنی جس کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ تھے وہ حضرت ابو بکر صدیق کے زمانۂ جمع القرآن کے وقت ہی موجودہ قرآن سے خارج کر دیا گیا تھا، جیسا کہ کہا گیا:

"حضرت اُبی بن کعب کی قرات اُن کے رتبہ کے لحاظ سے اگرچہ عالمگیر ہونا چاہئے تھی، لیکن کثرت سے رواج نہ پا سکی، اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ بہت سی آیتیں جو منسوخ ہو چکی تھیں وہ اُس میں موجود تھیں، حضرت عمر نے بارہا کہا کہ اُبی ہم میں سب سے زیادہ قرآن کے جاننے والے ہیں لیکن ہم کو بعض موقع پر ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے ان کو اصرار ہے کہ انہوں نے جو کچھ سیکھا رسول اللہ سے سیکھا اور یہ سچ ہے لیکن جب بہت سی آیتیں منسوخ ہو چکی ہیں اور ان کو اس کا علم نہیں ہوا تو پھر ہم ان کی (مکمل) قرات پر کیوں کر قائم رہ سکتے ہیں[3]۔"

حضرت اُبی بن کعب شاید منسوخ التلاوۃ آیات کو بھی اپنے مصحف میں باقی رکھنے پر مُصر تھے، اس لئے کہ خود رسول اللہ نے اُنہیں ان کے خارج کرنے کا اپنی زندگی میں کبھی کوئی حکم نہیں دیا تھا مگر اُنہیں ان کے منسوخ ہونے کا علم یقیناً ہو گا کیوں کہ یہ باتیں مشہورِ عام تھیں۔ جبکہ قرات یا تلاوت کے لئے نئے جمع کردہ قرآن میں ان منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ آیات کی موجودگی بعد میں قرآن کے مختلف نسخوں اور تلاوت میں اختلاف کا باعث بن سکتی تھی، جس پر حضرت عمر کی دوراندیشی، حضرت اُبی بن کعب سے اس معاملے میں اختلاف کا باعث بنی ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر کے استاد شیخ احمد ابو سعید عرف ملا جیون وفات ۱۱۳۰ھ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

" بھلا قرآن کا وہ حصہ جو حضور ﷺ کی حیات میں بُھلا دیئے جانے کی شکل میں منسوخ ہو گیا (یعنی البقرہ:۱۰۶، نیز النحل:۱۰۱) جیسا کہ مروی ہے کہ

2- اس بحث کے لئے دیکھئے، تفسیر منسوخ القرآن، از جناب رحمت اللہ طارق (ملتان پاکستان)

3- مسند احمد، جلد ۵ ص ۱۱۳، بحوالہ سیرت الصحابہ، حصّہ اوّل ص ۱۱۴، از جناب سعید احمد انصاری

سورہ احزاب، بقرہ کے برابر تقریباً تین سو آیات پر مشتمل تھا، اور اب یہ سورہ قرآن میں قریب ستّر (یعنی ۷۳) آیات پر مشتمل رہ گئی ہے اسی طرح سورہ طلاق بھی سورہ بقرہ کے برابر تھی، اب یہ صرف بارہ آیتوں کی رہ گئی (جن آیات) کا صرف حکم منسوخ ہوا اور تلاوت باقی رہی، مثلاً جیسا کہ قولہ تعالیٰ "لکُم دینکُم ولی دین" نیز اسی طرح کی تقریباً ستّر آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں جو جہاد کی آیتوں سے منسوخ ہیں، اور بعضوں نے کہا ہے کہ ترکِ قتال سے متعلق ایک سو بیس (۱۲۰) آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو جہاد کی آیتوں سے منسوخ ہیں، ان آیتوں کے علاوہ (یعنی ۷۰ یا ۱۲۰)۔ منسوخ الحکم آیتوں کی تعداد صاحبِ 'اتقان' علامہ جلال الدین سیوطی کی رائے میں (اب صرف) بیس (رہ گئی) ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ تعداد بیس سے زیادہ (یعنی) چالیس یا اس سے بھی زیادہ ہیں۔"

ملا جیون لکھتے ہیں:

"میں نے تفسیر احمدی میں ان سب کو اس قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ کتب احناف میں اس سے زیادہ نہیں پایا جا سکتا، البتہ شوافع نے اپنی کتابوں میں اس سے بھی زیادہ طوالت کے ساتھ بیان کیا ہے[4]۔"

جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا:

"میں نے امام محمد سے ایک اونٹ کے برابر کتابیں پڑھی ہیں.... (جس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ) میں نے حلال و حرام اور ناسخ و منسوخ کا ان سے زیادہ جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ (نیز) ان کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے، ان سے زیادہ فصیح و بلیغ اور ان سے زیادہ عقلمند آدمی میں نے نہیں دیکھا، (اسی لئے میں) امام مالک کے

4- انوار الانوار، ص ۳۰۵، از ملا جیون، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز مولوی مسافر خانہ کراچی

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

بعد امام محمد کو اپنا استاد مانتا ہوں[5]۔"

ملا جیون ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"امام زاہد نے کہا ہے کہ ہمارے اور شافعی کے درمیان بنائے اختلاف یہ ہے کہ خبر متواتر کے ساتھ قرآن (کی آیات) کا منسوخ ہونا ہمارے (یعنی احناف کے) نزدیک جائز ہے اور شافعیوں کے نزدیک جائز نہیں، بیشک آلِ رسول کا حصہ قرآن میں از روئے نص صاف مذکور ہے، اس پر خلفائے راشدین نے عمل نہیں کیا پس (یہ) آیات مبارکہ ہمارے نزدیک منسوخ ہو گئیں اور شافعی کے نزدیک منسوخ نہیں ہوئیں[6]۔"

قرآنِ کریم میں وقت کی مناسبت سے اکثر، اور کبھی کبھار وقتی طور پر یا کام چلانے کے لئے بھی احکامات نازل ہوا کرتے تھے جن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ کریم میں مومنین کو اس بات کے لئے تیار رہنے کی ہدایت فرمائی کہ موجودہ احکامات پر اس وقت تک عمل کرو یہاں تک کہ اللہ کوئی دوسرا حکم نازل فرما دے۔ مثلاً:

فاعفوا وَ اصفَحوا حتّٰی یأتِیَ اللهُ بِأمرِہ (البقرہ:۱۰۹)

پس تم معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا (کوئی دوسرا) حکم لائے۔"

یا فرمایا:

فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا (النساء:۱۵)

بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کو اٹھا لے یا اللہ ان کیلئے کوئی دوسرا راستہ بتا دے۔"

لیکن جب ایسی عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا تو سہواً یا کسی مصلحت کی بنا پر وہ حکم قرآنِ کریم میں درج نہ ہو سکا، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

"میں اس وقت جو کچھ بتا رہا ہوں اس کو میری طرف سے محفوظ کرو، اُن

5- تدوینِ سیر و مغازی، ص ۲۹۲، مولفہ قاضی اطہر مبارکپوری، مطبوعہ دارالنوادر اردو بازار لاہور

6- تفسیراتِ احمدیہ، ص ۴۳۷، از ملّا جیون

عورتوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ نازل فرما دیا ہے۔ "پس اگر مرتکب زنا کنوارے ہوں تو ان کیلئے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا، اور اگر شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے اور رجم کی سزا ہے[7]۔"

یہ تورات کا حکم بھی تھا، غالباً عرب معاشرہ اس سے متفق نظر نہیں آتا تھا اس کے لئے ہمیں خلافتِ راشدہ کے دور کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ کیا اس دور میں کسی شادی شدہ زانیوں کو رجم کی سزا دی گئی یا نہیں۔ خود رسول کریم کے زمانے میں جس قدر بھی رجم کی سزائیں دی گئی تھیں وہ زانیوں کی اپنی خواہش پر دی گئی تھیں جن کے زانی فریق ثانی کو نہ کبھی طلب کیا گیا نہ ان کے بارے میں کبھی پوچھا گیا کہ وہ کون تھے[8]۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں رسول کریم حتی الامکان ایسے واقعات کی پردہ پوشی چاہتے تھے[9] جسے اللہ تعالیٰ نے خود پوشیدہ رکھا ہو، آپ معاشرے میں اس کی تشہیر یا برملا اظہار جیسی بے حیائی کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اسی لئے آپ نے اور حضرت عمر نے ان واقعات میں زنا کے فریقِ ثانی کو نہ کبھی طلب کیا نہ کبھی اس کی جستجو کی۔

حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں وہ تمام آیات بھی تھیں جنہیں حضرت عمر کی خواہش پر حضرت ابو بکر صدیق کے زمانہ خلافت میں اوّل جمع القرآن کے وقت کتابت اور تلاوت دونوں سے خارج کر دیا گیا تھا کیونکہ ان کی تلاوت اور حکم دونوں حضور کے زمانے ہی میں منسوخ ہو چکے تھے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ حضرت اُبی بن کعب کو ان آیات کے منسوخ ہونے کا علم تو یقیناً ہو گا، مگر آپ اُنہیں اپنے مصحف سے خارج کرنے سے اتفاق اس لئے نہیں رکھتے ہوں گے کہ ان کی موجودگی پر خود آنحضرت اپنی حیات میں خاموش رہے اور اُنہیں قرآن سے خارج کرنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت اُبی بن کعب نے اپنا قرآن رسولِ خدا سے سن کر بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ

7- اشراق (بحوالہ مسلم کتاب الحدود)، ص ۴۲، از جاوید احمد غامدی، نومبر ۱۹۹۰ء لاہور

8- اس کیلئے دیکھئے، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص ۷۶ تا ۷۸ اور ۲۸۰، از مولانا محمد تقی امینی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

9- دیکھئے "عیب کی پردہ پوشی" پر احادیثِ نبوی، "آسان نیکیاں" از مفتی جسٹس محمد تقی عثمانی ص ۵۴۔۵۵

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

تحریر کیا تھا، آپ آنحضرت سے قرآن پڑھتے تھے اور پھر گھر جا کر اُس کو قلمبند کرتے جاتے تھے، یہی قرآن ہے جو تاریخِ فنِ قرآت میں مصحفِ اُبی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مصحف حضرت عثمان کے عہد تک موجود تھا اور اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت اُبی کی وفات کے بعد یہ ان کے بیٹے کے پاس رہا، جن کا نام محمد تھا اور وہ مدینے ہی میں رہتے تھے۔ (ایک دفعہ) عراق سے کچھ لوگ آئے اور کہا کہ ہم لوگ مصحف کی زیارت کو آئے ہیں مہربانی کر کے اُٹھالائیں، انہوں نے کہا کہ "وہ تو حضرت عثمان نے مجھ سے لے لیا تھا[10]۔ جبکہ حضرت عثمان غنی نے اپنے جمع و نقل کردہ قرآن کے سوا باقی تمام مصاحف جلا دیئے تھے۔

حضرت اُبی بن کعب کا جمع کردہ قرآن محض ذاتی ہی نہیں تھا۔ "قرّآءِ صحابہ میں اُبی بن کعب کو قرّاء القوم کا خطاب حاصل تھا۔ خاندانِ رسالت میں انہی کی قرأت رائج تھی[11]۔"

یہاں ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جن آیات کا حکم اب بھی باقی ہے اُنہیں درجِ قرآن ہونے سے کیوں روک لیا گیا تھا، یعنی ان کی تلاوت سے کیوں پرہیز کیا گیا اور جن آیات کے حکم باقی نہیں رہے تھے یعنی جن کے حکم منسوخ ہو چکے ہیں انہیں قرآن میں درج کرنے یا باقی رکھنے اور ان کی تلاوت کرنے میں کیا حکمت تھی؟ جبکہ کسی آیت کو خارج کرنے یا نہ کرنے کا اختیار پہلے جمع القرآن کے وقت خود حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر کو حاصل ہو چکا تھا، جس کے تحت حضرت اُبی بن کعب کے مصحف میں موجود منسوخ آیات کو درج نہیں کیا گیا تھا اور اگر کچھ کو باقی رکھا تھا تو دوسری منسوخ آیات کو کیوں خارج کر دیا گیا تھا؟ ایسی صورت میں یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ اُن تمام منسوخ آیات کو بھی ضائع ہونے سے بچا لیتے اور ایک الگ کتاب میں "آیاتِ منسوخہ" کے نام سے محفوظ کر لیتے، جیسا کہ آج بھی موجودہ قرآنِ کریم میں درج منسوخ آیات کو ویسے ہی ملتے جلتے حالات میں تاویل و تطبیق کے ذریعہ قابلِ عمل سمجھا یا بنا لیا جاتا ہے اور انہیں قرآن میں باقی بھی رکھا جاتا ہے۔

عملی شریعت یعنی فقہ کا ایک بہت بڑا حصہ آج بھی قرآن کے بجائے سنت پر ہی قائم ہے،

10- سیر انصار، حصہ اوّل، ص ۱۴۸

11- تاریخ القرآن، ص ۸۵۔۸۷، از جناب عبد الصمد صارم

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

جیسا کہ فرمایا گیا" قرآن کریم کے علاوہ فقہی مسائل سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ (بیشتر) حدیث و سنت پر مشتمل ہے، جن کا مدار تین ہزار حدیثوں پر ہے[12]۔"

جناب غلام احمد حریری لکھتے ہیں:

"شرح قرآن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آنحضرت نے ایسے احکام بیان کئے جو قرآن میں بیان کردہ احکام سے زیادہ تھے اور اس میں مذکور نہیں تھے، مثلاً بیوی کی پھوپھی، بھتیجی، اور خالہ و بھانجی سے بہ یک وقت نکاح کرنے کو حرام قرار دیا۔ صدقہ فطر کا حکم دیا، شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، دادی کا حصہ مقرر فرمایا، دو گواہوں کے بجائے ایک گواہ اور حلف کی بنا پر مدعی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا"

جناب حریری فرماتے ہیں:

"کتب فقہ میں اس کے علاوہ اور بھی بکثرت احکام مذکور ہیں (جو قرآن میں درج نہیں ہیں) شرح قرآن کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے (خود) ناسخ و منسوخ آیات کی نشان دہی فرمائی مثلاً آپ نے فرمایا کہ آیت وصیت اگرچہ قرآن میں موجود ہے مگر اس کا حکم باقی نہیں رہا، اس لئے وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی[13]۔"

آپ کے اس ارشاد سے اس بات کی اجازت کا پتہ چلتا ہے کہ منسوخ آیات کا قرآنِ کریم میں موجود رہنا اور ان کا تلاوت کیا جانا بھی آپ کی حیاتِ مبارکہ میں جائز تھا۔ تو پھر ایسی باقی تمام منسوخ آیات کو بھی اگر الگ کہیں محفوظ رہنے دیا جاتا تو یہ تاریخ القرآن پر عربوں کا ایک بہت بڑا احسان ہوتا۔ خصوصاً اسی صورت میں کہ جب کہ خود رسول اللہ کا ایسا کوئی حکم بھی حدیث نبوی میں موجود نہیں ہے کہ:

"اب تمام ایسی منسوخ الاحکام آیات کو قرآنِ کریم کی کتابت سے خارج کر دیا جائے۔"

12- تاریخ الحدیث، ص ۱۵۲، از قاضی عبدالصمد صارم

13- تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۵۸

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

پھر باقی تمام منسوخ آیات کا اتلاف، جو حضرت اُبی بن کعب کے مصحف میں درج تھیں، کس حکمِ خداوندی یا ارشاد نبوی کے تحت کیا گیا تھا؟ (جیسا کہ) "اہل السنۃ کے جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس آیت (البقرہ:۱۸۰) کا حکم منسوخ ہو چکا ہے.... نیز حدیث 'لا وصیۃ للوارث' سے بھی یہ آیت منسوخ ہے۔ اس حدیث کے بارے میں امام شافعی نے 'کتاب الامّ' میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے[14]۔"

آنحضرت اور آپ کے بعد صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین پھر ان کے بعد چوتھی صدی ہجری کے ابتدائی زمانہ تک صرف معتزلہ کے علاوہ باقی تمام مسلمان بلا شک وشبہ قرآن کریم کی آیات میں کثرت سے نسخ کے قائل پائے جاتے رہے۔ غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اصفہانی (۲۵۴ھ تا ۳۲۲ھ) اور امام فخر الدین رازی (متوفّٰی ۶۰۶ھ) نے پہلی بار قرآنِ کریم کی آیت ما ننسخ من آیۃ (البقرہ:۱۰۶) میں متقدمین کی مقبولِ عام روش سے ہٹ کر بالکل ہی نئے معنی کی طرف توجہ دلائی۔ ابو مسلم اور امام رازی کے متقدمین کوئی معمولی شخصیات نہیں تھیں ان میں رسول اللہ سے لے کر صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور پھر ان کے بعد چار سو سال تک کے تمام علماء اور مسلمان بھی شامل تھے جو قرآنِ کریم میں نصوصِ قرآنی ہی کی بنا پر نسخ فی القرآن کے قائل تھے۔

پہلا مفسر ابو مسلم ہے جس نے قرآن میں ناسخ و منسوخ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے (جسے اس زمانے میں بہت اجنبی خیال سمجھا گیا تھا) امام رازی خود بھی فرماتے ہیں "پہلے تو میں بھی اثباتِ نسخ کے لئے زیرِ بحث آیت کی طرف رجوع کیا کرتا تھا لیکن تفسیر لکھتے ہوئے مجھ پہ یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ میرا استدلال کمزور تھا کیونکہ "مانسخ" کی "ما" شرط اور جزا کا فائدہ دیتی ہے، یعنی اس سے صرف اتنا ہی مترشح ہوتا ہے کہ جب بھی نسخ واقع ہو[15]۔"

یہاں امام رازی نے جس استدلال کو "میرا استدلال" کہا ہے دراصل وہ آنحضرت، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے نصوص قرآنی کی بنا پر عملِ نسخ اور سنت کا ابطال تھا۔ جیسا کہ خود

14- تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۱۳۷

15- منسوخ القرآن، ص ۸، فصل اوّل، از جناب رحمت اللہ طارق

امام رازی نے فرمایا، "قرآن سے منسوخ ہونا جمہورِ فقہا کے نزدیک ثابت ہے اور اس میں سوائے ابو مسلم اصفہانی کے کسی کو اختلاف نہیں[16]۔"

ناسخ و منسوخ کے بارے میں امام رازی نے رسول خدا اور صحابہ کرام کے عمل کو محض جمہورِ فقہاء کہہ کر بے وقعت بنا دیا تھا۔ نیز امام رازی کے اس فرمانے پر کہ "مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ میرا استدلال کمزور تھا کیونکہ "مانننسخ" کی "ما" شرط اور جزاء کا فائدہ دیتی ہے، یعنی اس سے صرف اتنا ہی مترشح ہوتا ہے کہ جب بھی نسخ واقع ہو۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو قرآن کریم میں کبھی نسخ واقع کرنا مقصود ہی نہیں تھا تو پھر اس آیت "مانننسخ من آیة" (بقرہ:۱۰۶) کو نازل فرمانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآن کریم میں اس آیت کا نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ نسخ واقع ہو گا، اور پھر قرآن کے مخاطبوں نے دیکھ بھی لیا کہ ایسا ہوا بھی:

> "اور جب ہم بدل دیتے ہیں ایک آیت (حکم) کی جگہ دوسری آیت، اور اللہ خوب جانتا ہے جو نازل کرتا ہے (اس وقت) وہ کہتے ہیں کچھ نہیں کہ تم (ایک کی جگہ دوسرا حکم خود) گھڑ لیتے ہو۔ آپ کہہ دیجئے کہ (اس دوسرے حکم کو بھی) تمہارے رب کی طرف سے روح القدس (ہی پہلے) حق کی طرح نازل کرتا ہے تاکہ مسلمان ثابت قدم رہیں، اور (نیا حکم بھی) ان کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہوتی ہے۔" (النحل:۱۰۱-۱۰۲)
>
> "اور اللہ جسے چاہتا ہے قائم رکھتا اور جسے چاہتا ہے بھلا دیتا ہے۔" (الرعد:۳۸-۳۹)

اہلِ ایمان کے رویّوں میں منسوخ القرآن کے تسلیم کئے جانے کا عمل اب بھی جاری ہے جس کے تاریخی شواہد بھی ہمیں ملتے ہیں۔ اور اگر قرآن کریم میں گزشتہ اور موجودہ نسخ کو تسلیم نہیں کیا گیا تو کلام الٰہی میں صریح اختلاف پایا جائے گا، جو سورہ نساء کی آیت ۸۲ کے حوالے سے ثبوت فراہم کرنے کا موجب بنتا ہے۔

16- تفسیر امام رازی، جلد ۱، ص ۴۳۵۔ بحوالہ فلسفہ اسلام، ص ۱۰۳، از ڈاکٹر صبحی محمصانی

"پھر کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اور اگر (یہ قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کے پاس سے ہوتا تو اس میں ضرور بہت اختلاف پاتے۔" (النساء:۸۲)

امام رازی سے پہلے بھی بعض لوگوں کو نسخ فی القرآن نے فکر مند کر دیا تھا، کیونکہ اس سے قرآن کریم کا ایک بہت بڑا (اُبی بن کعب والا) اور موجودہ حصہ منسوخ ہو جاتا ہے، اور ایسی سوچ بیشتر غیر عربوں کی تھی۔ جبکہ اہلِ عرب جن پر یہ قرآن براہِ راست نازل ہوا تھا انہوں نے بلا تردّد ایسی تمام آیات کو بڑی خوشی سے منسوخ مان لیا تھا جو بعد میں نازل شدہ احکامات سے مختلف ہو گئی تھیں جن میں سے بعض بعد میں عرب و عجم کی تخصیص کے کام میں بھی آئیں۔ مثلاً "لا اکراہ فی الدین" جو عربوں کے حق میں تو منسوخ ہو گئی تھی مگر اہلِ عجم کے لئے بعد میں جزیہ اور ذمی بنائے جانے کے لئے بہت کام میں آئیں جو اپنے نزول کے وقت اہلِ انصار کے جدید یہودیوں کے لئے یا قریش اور عربوں کے لئے نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح جہاد کی بھی بہت سی ایسی آیات اب بھی قرآن میں موجود ہیں جن کے معنی اہلِ عرب اور اہلِ عجم کے لئے مختلف ہیں۔

عرب مسلمانوں کے اوّلین اسلاف یعنی صحابہ کرام اور فقہا کے نزدیک یہ بات مسلّمہ تھی کہ جو شخص ناسخ و منسوخ کی گہرائیوں کا علم نہیں رکھتا اسے قرآن پاک کی تشریح بیان کرنے کا کوئی حق نہیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے کہ باعثِ ہلاکت بھی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں، "اس سلسلے میں صحابہ اور تابعین کے تمام اقوال کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لفظ نسخ کو اس کے اصلی اور لغوی معنے ہی میں استعمال کرتے تھے، یعنی ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے ذریعے مٹا دینا[17]۔" جس کے تحت صحابہ کرام اور تابعین کے نزدیک موجودہ قرآن میں احکامات سے متعلق منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق کے زمانے میں سب سے پہلے جو قرآن (فی دفتین) جمع ہوا تھا اس سے پہلے جو بیشتر آیاتِ قرآنی منسوخ ہو چکی تھیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ہمارے زمانے کے ایک جیّد عالم جناب محمد عبد اللہ درخواستی فرماتے ہیں:

17- الفوز الکبیر، ص ۵۶، نیز ص ۱۵۱۔ مطبوعہ قرآن محل، کراچی نمبر ۱

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

"بہر حال متقدمین کی تعریف کے اعتبار سے تو بلا شک وشبہ قرآن کی آیات میں کثرت سے نسخ موجود ہے"....[18]

جبکہ مولانا درخواستی خود بھی سر سید احمد خان کی طرح موجودہ قرآن میں کسی قسم کے نسخ کے قائل نہیں۔ البتہ موجودہ قرآن کے علاوہ خلافتِ راشدہ کے اوّل جمع القرآن سے قبل کا نسخ اس وقت ان حضرات کے زیر بحث نہیں ہوتا۔

دراصل "متقدمین" کی اصطلاح سے مخالفینِ نسخ فی القرآن (یعنی قرآن کریم کی کسی آیت سے پہلی نازل شدہ مختلف الحکم آیت کا کلّی یا جزوی منسوخ ہونا) کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ صحابہ کرام کے اس قبولِ نسخ کے عمل سے رسول کریم ﷺ کو جدا رکھا جائے، جبکہ خود رسول اللہ نے صحابہ کرام کو ناسخ و منسوخ کی تعلیم فرمائی تھی۔

قرآن اپنے زمانہ نزول میں ایک زندہ اور بر محل و متحرک کتاب تھی جو حالات کے ساتھ ساتھ خالقِ کائنات کی ہر چیز کی طرح تغیّر پذیر تھی، سوائے قانونِ فطرت کے، اس لئے کہ قرآن خود قانونِ فطرت نہیں بلکہ اس وقت کے اہلِ عرب کے لئے شریعت کی ایک کتاب تھی اور شریعتیں کبھی بھی اٹل نہیں ہوا کرتیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت اور زمانہ مقرّر کیا ہوا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ"

ہر مقرّر وقت کیلئے (شریعت کی ایک الگ) کتاب ہے، مٹا دیتا ہے اللہ جس (حکم) کو چاہتا اور باقی رکھتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اُس کے پاس اصل کتاب ہے۔"

(الرعد:۳۸۔۳۹)

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم فرماتے ہیں:

"از روئے قرآن عملِ تنسیخ عملِ ارتقاء ہے" (مقالاتِ حکیم، جلد سوم ص ۱۲۷)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی نسخ فی القرآن سے کچھ پریشانی ضرور محسوس کرتے تھے لیکن

18- مقدمۃ القرآن ص ۸۵-۸۶، مطبوعہ مکتبہ مدینہ مخزن العلوم، خان پور

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

خود پر معتزلی ہونے کے الزام سے ڈرتے تھے، اس لئے شاہ صاحب کے بارے میں جناب مولانا محمد عبداللہ درخواستی لکھتے ہیں:

"اُنہوں نے نسخ کے متعلق عام عقیدہ (یعنی متقدمین) کی تردید اور اس کی اصلاح میں حکیمانہ اسلوب اختیار کیا ہے، وہ جانتے تھے کہ اہلِ علم حضرات مدتِ مدید سے نسخ فی القرآن کے قائل رہے ہیں، اور جو شخص کلی طور پر انکار کرتا ہے اُسے وہ معتزلہ میں شمار کریں گے، اور اُس کے کلام میں غور کرنے کو ترک کردیں گے (چنانچہ) اپنے زمانے کے اہلِ علم کے اس عام رجحان کے پیشِ نظر شاہ صاحب موصوف اس مسئلے کو تدریجاً سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا درخواستی فرماتے ہیں:

"پہلے اہلِ علم (غالباً تابعین کے بعد) قرآن حکیم میں تقریباً پانچ صد آیات میں نسخ تسلیم کرتے رہے، لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر "الاتقان فی علوم القرآن" میں صرف بیس آیات منسوخ تسلیم کیں، اس مسئلہ میں جلال الدین سیوطی اپنے متقدا اور پیش رو قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ المعروف بہ ابن عربی☆ کے نقش قدم چلے ہیں۔ ان کے بعد شاہ صاحب اُن بیس آیات میں سے پندرہ کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ اُن کا منسوخ ہونا ساقط ہو جاتا ہے، اب رہیں وہ پانچ آیات جن میں (خود) شاہ صاحب (بھی) نسخ کے قائل ہیں وہ صرف پانچ ہیں[18]۔"

جن کی تفصیل یہ ہے: پہلی آیت البقرہ:۱۸۰ ہے۔ اس کی ناسخ، النساء:۱۱ ہے۔ دوسری آیت قتال کے بارے میں ہے، جو سورہ الانفال کی ۶۵ ویں آیت ہے، اس کی ناسخ اسی سورۃ کی اگلی ۶۶ ویں آیت ہے۔ تیسری آیت سورۃ الاحزاب ۳۳ کی ۵۰ ویں آیت ہے، اس کی ناسخ بھی الاحزاب ہی کی ۵۲ ویں آیت ہے۔ چوتھی آیت سورۃ المجادلہ کی ۱۲ ویں آیت ہے، اس کی ناسخ

☆- ابن عربی کی وفات ۶۳۸ھ میں ہوئی تھی۔

18- مقدمۃ القرآن، ص ۸۵۔۸۶، مطبوعہ مکتبہ مدینہ مخزن العلوم، خان پور۔

بھی اسی آیت کے بعد کا حصہ ہے اور پانچویں سورہ مزمّل کی ۱ اور ۲ ہیں، ان کی ناسخ اسی سورۃ کی ۲۰ ویں آیت ہے۔

ان پانچ منسوخ حکموں میں سے پہلی کا تعلق وصیت سے ہے، اور دوسری کا جہاد سے جن کا تعلق کافروں اور مومنوں کے ایک اور دس، اور ایک اور دو کے تناسب سے تھا، جن کے حکم اب بھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ تین کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ذات سے تھا جو اب مؤثر نہیں رہیں۔ قرآن کریم کی ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا تعلق صرف رسول اللہ یا آپ کی ازواجِ مطہرات یعنی ام المومنین سے ہی تھا، جو اب اس دنیا میں ہیں ہی نہیں لیکن ان سے متعلق احکامات اب بھی قرآن کریم میں موجود ہیں۔

جمع القرآن سے پہلے جو حصّہ منسوخ ہو چکا تھا اس کے بارے میں شیخ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

> "اور اس میں کچھ شک نہیں کیا جا سکتا کہ آخری دور میں قرآن کے بعض حصّے منسوخ کر دئے گئے تھے، اس لئے صحابہ کی رائے اس بات پر متفق ہوئی کہ جس قدر حصّوں کا آخر کے دور میں قرآن قرار پانا ثابت ہوا (صرف) اُسے لکھ لیا جائے[19]۔"

آپ فرماتے ہیں:

> "کہا جاتا ہے کہ زید بن ثابت اُس قرآن کے آخری دور میں حاضر رہے تھے جس کے اندر بیان کیا گیا تھا کہ کتنا حصّہ قرآن کا منسوخ ہو گیا، اور کس قدر باقی رہا، اور زید بن ثابت ہی نے اُس کو رسول اللہ کے لئے لکھ کر پھر اُسے آپ کو سنا کر پڑھا تھا۔ اور چونکہ زید بن ثابت اُسی قرآن کو تا وقتِ وفات لوگوں کو پڑھاتے رہے تھے اسی واسطے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے اُس قرآن کو قابلِ اعتماد مان کر جمع کر لیا* اور حضرت عثمان نے اُسے مصحف میں لکھنے کی

19- الاتقان، ص ۱۳۱۔ ۱۳۲

*- اور بعد میں حضرت عمر نے باقی ماندہ آیات کو بھی بڑی احتیاط سے جمع کر کے قرآن کو مکمل کر لیا تھا

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

خدمت ادا کی[20]۔"

اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ قرآن کی بہت سی آیات رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منسوخ تسلیم کر لی گئی تھیں، یقیناً ان کی منسوخی کی کوئی تو وجہ ضرور ہو گی۔ جب قرآن میں نسخ کو ایک بار تسلیم کر لیا گیا تھا تو اسی اصول کے تحت اب قرآن کریم کی باقی منسوخ آیات کو بھی منسوخ سمجھنے میں امام رازی یا علامہ جلال الدین سیوطی کو کیا دشواری پیش آ رہی تھی؟ جس کے لئے نئے نئے مباحث پیدا کئے گئے۔ شاید انہیں یہ بات پریشان کر رہی ہو کہ رسول کریم کے زمانے میں جمع کردہ قرآن میں سے جب تمام منسوخ آیات پہلے ہی خارج کر دی گئی تھیں تو یہ باقی آیات کیوں چھوڑ دی گئیں؟ جس کے لئے انہیں ان کی تاویل پر توجہ دینی پڑی ہو۔ مگر اس سے قرآن کریم میں نسخ کے وجود سے تو پھر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو بقول خلیفہ عبد الحکیم:

" از روئے قرآن، عمل تنسیخ بھی دراصل عملِ ارتقاء کا ایک حصّہ تھا"

جسے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام سب نے بخوشی قبول کر لیا تھا، اس لئے کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کو قبول کرنے والے سب سے پہلے رسول اللہ خود تھے۔

قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں میں شرعی احکامات میں جو تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی رہیں وہ بھی وقت اور حالات کا ہی نتیجہ تھیں کیونکہ کوئی جامد یا غیر متبدل اصول و ضوابط بدلتے ہوئے زمانے اور مقامی حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے، جہاں تک پہلی کتابوں کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کی طرح وقتاً فوقتاً ہاتھ کے ہاتھ جمع و تحریر نہیں کی گئیں تھیں جو قرآن کریم کی طرح منسوخ ہوتی ہوئی نظر آتیں، وہ تو اس تمام عمل سے گزر جانے کے صدیوں اور برسوں بعد جمع اور تحریر کی گئیں جن کے منسوخ یا قائم رہنے والے حصّے قرآن کریم کی طرح کبھی بھی پہلے دوسرے اور تیسرے مرحلے کی طرح تحریری شکل میں موجود نہیں رہے تھے۔

قرآن کریم کے احکامات رسول اللہ کی تئیس سالہ زندگی میں کئی بار تحریر و تبدیلی اور اضافے کے مراحل سے گزرے تھے، جن کا تحریری ریکارڈ بھی حضرت عثمان غنی کے جمع

20- الاتقان، ص ۱۳۲، (اردو)

القرآن کے وقت تک موجود تھا۔ "لِكُلِ اجلٍ كتابٌ" اور اجل کا لفظ ہر ہر لمحے بدلنے والے واقعات کے لئے استعمال ہوا ہے جسے کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے، قرآن بھی اسی معنوں میں ایک کتاب ہے جس میں قرآن کی حکمتِ عملی ناسخ و منسوخ کے ذریعہ خود بھی ہمیشہ حالات کے ساتھ ساتھ لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہی تھی، جس کے بارے میں امام راغب فرماتے ہیں:

"عقلی اوامر و نہی میں زمانہ گزرنے کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور کسی بھی زمانہ میں منسوخ نہیں ہوتا، جبکہ شرعی اوامر و نہی میں کسی امر کی افادیت کے مطابق تبدیلی اور نسخ واقع ہوتا ہے۔" (مقدمۃ التفسیر ص ۳۴، اور ۷۲۔۷۹)

جناب مولانا محمد تقی امینی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب تک نزولِ شرائع کا سلسلہ جاری رہا، (قرآنی) ہدایت نے صرف زمانہ نزول کے معاشرے کو اپنا مطمح نظر بنایا اور جب یہ سلسلہ بند ہوا تو ہدایت کے بنیادی قواعد میں تمام اُن نئے احوال و ظروف کو بھی جگہ دی گئی جو بعد میں ظہور پذیر ہونے والے تھے، چنانچہ نزولِ ہدایت کے وقت عرب کا معاشرہ سادہ تھا، عقلی موشگافی اور تمدنی سج دھج کو اس میں دخل نہ تھا، سادہ ذہن کے مطابق احکامِ شرعیہ نہایت سادگی کے ساتھ عرب کے جسم و بدن پر فٹ آگئے۔ لیکن جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور ایرانی، رومی، کلدانی، حبشی، قبطی، ترکستانی اور سندھی قومیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئیں یا زیرِ اقتدار آئیں تو وہ اپنا مخصوص معاشرہ اور تمدن ساتھ لائیں، ان کے عادات و معاملات (عربوں سے) مختلف تھے، معاشی و سیاسی نظام میں تفاوت تھا، کہیں ایرانی تہذیب و قانون کو دخل تھا تو کہیں رومی تمدن و قانون کا اثر تھا۔ غرض عجمیوں کے اختلاط سے ایک عجیب کشمکش پیدا ہوئی، اور ان کے ساتھ معاملات سے نئی نئی ضرورتیں ابھریں اور بہت سے نئے مسائل حل طلب قرار پائے، جن کی وجہ سے عرب کی سادگی کو دھکا پہنچا اور احکام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی دے کر ان کے دامن کو وسیع

کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

آپ فرماتے ہیں:

معاشرہ شریعت سازی کی بنیاد ہے اور احوال و مصالح عمارت تعمیر کرنے کے سامان ہیں۔ جب معاشرے میں تبدیلی ہو گی تو لازمی طور سے احکامِ شرعیہ کی شکل وصورت بدلے گی اور جب احوال و مصالح باقی نہ رہیں گے تو ان سے بنی ہوئی (سابقہ) عمارت بھی ختم ہو جائے گی[21]۔"

شریعت بھی مقام اور حالات وزمانے کے مطابق حکمت عملی کا ہی دوسرا نام ہے ؏

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

تغیّر دو طرح کا ہوتا ہے، ایک رو بہ تعمیر یا تکمیل کی طرف اور دوسرا رو بہ زوال یا فرسودگی کی طرف، ہر شئے اپنی تکمیل یا ضرورت پوری ہو جانے کے بعد ایک قلیل عرصہ کے لئے "تغیر ثبات" سے گزرتی ہے جو بظاہر ثبات نظر آتا ہے مگر وہ بھی ایک واہمے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

روئے زمین پر آج ہم بے شمار محل، قلعے اور اُجڑے ہوئے باغات دیکھتے ہیں جو اپنے زمانہ استعمال میں زندگی سے بھرپور تھے، جب ان کے آباد کرنے والے یا ضرورتمند زندہ تھے تو وہ آباد تھے اور ان کی تزئین و آرائش پر ہمہ وقت نظر رکھی جاتی تھی، لیکن آج وہ سب کے سب آثار میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کسی کتاب میں ضرورت کے مطابق ناسخ و منسوخ کا عمل بھی تزئین و آرائش ہی کا دوسرا نام ہے۔ قرآن کریم بھی اپنے زمانۂ نزول میں اپنے مخاطبوں کے لئے ایک زندہ، برمحل یعنی حسبِ حال کتاب تھی جس کی تزئین و آرائش کا کام تنسیخ و تنزیل سے لیا جارہا تھا جس سے یہ دن بدن سنور رہا تھا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ ان کے لئے مکمل ہو گیا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"الیومَ اکمَلتُ لکُم دینَکُم و اَتممتُ عَلیکُم نعمَتی" (المائدہ:۳)

21- احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص ۲۲-۲۳

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

"(اے اولادِ ابراہیم) آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔"

اس آیت میں "دین" سے مراد شریعت ہے، دِینُکم یعنی تم سے متعلق اور تمہارے موجودہ حالات سے متعلق شریعت۔ لیکن کسی چیز کا مکمل ہو جانا اس کے دائمی ہو جانے کی ضمانت یا دلیل نہیں بن جاتی کیونکہ ہر چیز اپنی تکمیل کے فوراً بعد سے فرسودگی کے عمل سے دوچار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کا نہ بدلنے والا قانون یا اُس کی سنت ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ وہ پہلے کسی چیز کو عناصر سے وجود بخشتا ہے پھر اُسے دِنوں، برسوں یا لاکھوں سال تک سنوارتا ہے، جیسے خود انسان کو ارتقاء کے ذریعہ خوب سنوارا یعنی:

اور پھر ایک ناقابلِ ذکر جرثومے کو ایک قابلِ ذکر اشرف مخلوق انسان کی صورت میں بدل دیا (الدھر:۱)

تو کیا انسان کی تکمیل یا اشرف المخلوقات بن جانے سے اسے زمین پر دوام حاصل ہو گیا؟ بچّے پیدا ہوتے ہیں پرورش پاتے ہیں اور جوان ہو جاتے ہیں پھر اُن پر انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے عروج کی حالت سے بدتر حالت کی طرف لوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم خود جانتے ہیں کہ ہمیں جن جن خاکی عناصر سے وجود بخشا جاتا ہے، پھر انہی عناصر کی خاک میں ملا کر پنہاں کر دیا جاتا ہے ؏

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

شریعتوں کا بھی یہی حال ہے، اب کوئی نئی شریعتیں تو آنے والی نہیں کیونکہ انسان اب اپنی تاریخ سے سبق اور اپنی عقل اور علم سے کام لینے کے قابل ہو گیا ہے لہٰذا اب جو قومیں ان سے کام لینا نہیں سیکھیں گی وہ پہلے کی طرح اب بھی صفحۂ ہستی سے جلد یا بدیر نیست و نابود ہوتی رہیں گی۔ ذاتِ خداوندی کے سوا (جو انسان کے وجود سے قائم ہے) انجام تو سب کا ایک ہی ہونا ہے لیکن جو قومیں اپنے پیچھے اپنی اچھی مثال چھوڑ جائیں گی آنے والی دنیا ان سے کچھ نہ کچھ رہنمائی

ضرور حاصل کرے گی اور جو جہالت اور انتشار میں پڑ کر برباد ہو جائیں گی آنے والی دنیا ان سے عبرت حاصل کرتی رہے گی۔ کیا دنیا کے صالح انسان اور کامیاب قومیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں؟

قرآنِ کریم جن کے لئے نازل اور مکمل کیا گیا تھا انہوں نے اس سے کام لے کر اپنے وقتی مسائل حل بھی کر لئے تھے۔ آج سے چودہ سو سال پیشتر قریش قوم یا عربوں کے مسائل حل ہو جانے سے اس وقت تمام بنی نوع انسان کے مسائل تو حل نہیں ہو گئے تھے! عربوں کے علاوہ دوسری قومیں تو ان کے زیرِ نگیں ہو کر ان کی محکوم اور جزیہ گذار بن گئی تھیں۔

کیا دیگر اقوام کا کسی ایک قوم کا محکوم ہو کر جزیہ گذار یا ذمّی بن جانا اُن کے لئے کوئی نعمت خداوندی تھی؟ قرآن اُس وقت عربوں کے ارد گرد بسنے والی قوموں کے لئے کوئی نوید یا خوشخبری لے کر نہیں آیا تھا، اگر عربوں کی جنگوں کے نتیجے میں یہی محکومی کا فیصلہ عربوں کے حق میں ہو جاتا تو کیا وہ اپنی اُس حالت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے اور خوشیاں مناتے اور سمجھتے کہ یہ ہم پر 'اَتممتُ علیکُم نعمتی' یعنی اتمامِ نعمت کی گئی ہے۔ لہٰذا عربوں کے علاوہ دوسری تمام قوموں کو سمجھنا چاہئے کہ قرآن کریم کا تمام تر اندازِ تخاطب اپنے وقت کے لئے، زمانۂ حال کے صیغہ میں ہے، قرآن جو کچھ بھی کہتا ہے اپنے وقت اور اپنے سامنے موجود لوگوں کے حسبِ حال اور اُنہیں مخاطب کر کے کہتا ہے۔ اس لئے جب وہ مسائل اور اُس کے مخاطب ہی نہیں رہے تو اُس کا خطاب بھی ماضی کی داستان بن گیا ہے۔ مثلاً اس میں بے شمار ایسے احکامات موجود ہیں جن پر عمل کے مواقع آج موجود ہی نہیں ہیں اس لئے ان احکامات پر عمل کرنا بھی ناممکن ہے نیز اُس وقت جن مشرکین اور کفار کو مخاطب کر کے عجم سے پنجہ آزمائی کے لئے قومی یکجہتی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، وہ اُس وقت کے تمام دنیا کے مشرکین اور کفار کے لئے ایک عام خطاب نہیں تھا، اس لئے دوسرے مشرکین پر وہی الزام لگا کر اُن سے کسی قسم کا مطالبہ کرنا یا جہاد کرنا سخت ناانصافی تھی اور رہے گی کیونکہ قرآنِ کریم کا ہر عام حکم اپنے مخصوص مخاطبوں کے لئے خاص تھا۔

قرآنِ کریم اُس وقت جن مشرکین سے مخاطب تھا اُن کا معاملہ خاص تھا یعنی اُن کا اولادِ اسمٰعیل سے ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں پر آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا فرض

کر دیا تھا، اور انکار کی صورت میں صرف اُن کے لئے ایک مدّت مقرر کر دی گئی تھی جس کے بعد اُنہیں قتل کر دینے تک کا حکم دے دیا گیا تھا، نیز اسلام قبول کر لینے کے بعد ارتداد کی سزا "قتل" بھی صرف انہی کیلئے مقرر کی گئی تھی کیونکہ وہی سب حکومتِ مدینہ کے ہم وطن، ہم قوم اور ہم نسل تھے۔(دیکھئے وضاحت کیلئے ماہنامہ اشراق، مرتد کی سزا، جاوید احمد غامدی، ۲۳، فروری ۱۹۸۹ء) آیتِ قتال کے بعد اہلِ وطن کے لئے صرف ایمان یا جنگ کا مطالبہ تھا، جبکہ اہلِ عجم سے جنگی محاصروں کے بعد تیئس سالہ تبلیغ اسلام کی جگہ نہایت عجلت کے ساتھ مختصر مدّت میں سرسری طور پر مطالبے کے بعد بغیر کسی قسم کی تعلیم یا تبلیغ کے جنگ یا جزیہ کا مطالبہ پیش کر دیا جاتا تھا، یعنی ہم قوم افراد سے جنگ برائے ایمان، کیونکہ قومی نبوت کے تحت اُن سے کبھی بھی جزیہ کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا تھا ورنہ نبوت کا مقصد ہی ختم ہو کر رہ جاتا، ان کی جگہ غیروں سے جبراً ایمان کا مطالبہ اس لئے نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کے بعد جزیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا جس کے عوض اُنہیں کفر و شرک کی اجازت دی جانی تھی، دوسرے قرآن کریم میں غیروں کے درمیان تبلیغ اسلام کے لئے کوئی ایک بھی واضح آیت موجود نہیں تھی جس کے تحت غیروں میں تبلیغ اسلام کی جاتی۔ جہاں تک جزیہ کا تعلق ہے، قرآن کریم میں جزیہ سے متعلق کوئی آیت نہیں سوائے ایک آیت (توبہ :۲۹) کے جو صرف خاص عرب کے اہلِ کتاب یہودیوں کے لئے ہی نازل ہوئی تھی وہ بھی اعتاب کے لئے، لیکن آنحضرت کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ اور اُن کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں نے اِس آیت کریمہ کا اطلاق پوری دنیا کے عجمیوں پر کر دیا۔

قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات موجود ہیں جو قرآن کے ایک خاص قوم، وطن اور زمانے سے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ آنحضرت کی ذاتِ اقدس سے متعلق جو اُس وقت اُن کے درمیان موجود تھے، قرآن کا اپنے مخاطبوں سے اس انداز میں گفتگو کرنا کہ "تمہارا رسول تمہارے درمیان موجود ہے" خاص لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے حالانکہ نہ اُس وقت آپ کسی اور قوموں کے درمیان موجود تھے اور نہ آج موجود ہیں، اس لئے ایسا تمام کلام خاص وقت اور خاص لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن کریم کا عربی زبان میں ہونا، "فانما یسّرنہ

بِلسانِکَ" رسول اللہ کے بارے میں یہ فرمانا کہ یہ تمہارے اپنے ہی (نسلی، قومی، خاندانی اور) خونی رشتے سے تعلق رکھتے ہیں جس پر تمہاری تکلیفیں گراں گزرتی ہیں اور یہ تمہاری بھلائی پر بہت حریص ہیں۔ "لقدجآء کُم رسول من انفسکُم"... (توبہ:۱۲۸) جبکہ اس میں اہلِ عجم سے ہمدردی کے بارے میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے جو کسی ایک دور کے عربوں سے خاص تعلق کو منسوخ کر کے قرآن کو ایک عالمگیر خطاب ظاہر کر سکے۔ اس لئے قرآن کریم کی ایسی تمام آیات کا تعلق بھی اسی دور کے عرب مسائل سے تھا جن کا تعلق ناسخ اور منسوخ آیات سے رہا تھا۔

اس باب میں سب سے پہلی غلطی اہلِ عجم سے ہوئی تھی جنہوں نے قرآنِ کریم کو ایک عالمگیر خطاب سمجھ کر اس میں موجود باقی ماندہ منسوخ آیات کو تاویلات کے ذریعے دنیا کی دوسری قوموں اور آئندہ زمانوں پر چسپاں کرنے کے لئے انہیں غیر منسوخ ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

تاریخ جمع القرآن کی اکثر روایات میں قرآنِ کریم کو از سرِ نو لکھنا بھی اسی لئے بیان کیا جاتا ہے جس کی بڑی وجہ نئے مرتب کردہ قرآن سے منسوخ آیات کو حتی الامکان خارج کرنا مقصود تھا ورنہ اس وقت خود رسول اللہ کے کتابت شدہ قرآن اور حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت اُبی بن کعب کے علاوہ اور بھی بہت سے مکمل اور غیر مکمل قرآن صحابہ کرام کے پاس محفوظ تھے جن میں اکثر وہ تمام منسوخ آیات بھی درج تھیں جو رسول اللہ اور صحابہ کبار کے نزدیک متفقہ طور پر منسوخ تسلیم کر لی گئی تھیں جن میں صرف شرعی احکامات ہی نہیں تھے بلکہ بعض تخمینے اور وقتی تقاضے بھی شامل تھے۔ یہی وجہ تھی جو حضرت ابو بکر صدیق کا مرتب کردہ قرآن بے شمار منسوخ آیات سے پاک سب سے پہلا اور مستند قرآن تمام صحابۂ کرام نے بلا اختلاف خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد علماء متاخرین نے صرف قرآن کی باقی ماندہ منسوخ آیات پر ہی غور کیا جو قرآن میں باقی رہ گئی تھیں اور اسلامی شریعت میں نسخ فی القرآن سے انکار کا یہ سلسلہ معتزلہ سے شروع ہو کر سر سید احمد خان پر ختم ہوا۔

جمع القرآن اور اس کی حفاظت کا مسئلہ

ترکی کے مشہور انقلابی عالم جناب جلال نوری بے فرماتے ہیں " قرآن کا کتابی شکل میں جمع کرنا کوئی اچھا یا سود مند کام نہیں تھا، اور نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن جمع کرنے کا کبھی کوئی خاص حکم دیا ہو۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی کی قرآن جمع کرنے کی کوشش کوئی صحیح اقدام یا قابلِ تعریف بات نہیں۔ بہر حال ہمیں قرآن میں کچھ ہدایات و احکام ضرور ملتے ہیں، مگر اُن کا تعلق مخصوص حالات سے تھا جنہیں کتابی شکل دینا کوئی قابلِ فخر بات نہیں کیونکہ رسول اللہ نے ہمیں ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا، نہ آپ کا خود کوئی ایسا منشا تھا۔ قرآن کے جامع اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ " قرآن کا ہر حکم اپنے زمانے کے مخصوص حالات کے تحت کسی خاص موقع و محل سے متعلق ہے[1]۔"

جیسا کہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ خود حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت زید بن ثابت شروع میں قرآن کریم کی کتابت اور اس کے جمع کرنے سے حضرت عمر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکر نے بھی فرمایا تھا کہ جو کام خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا (یعنی تدوین) اور ہمیں اس کا حکم بھی نہیں دیا تو اُسے ہم کیونکر کر سکتے ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت نے فرمایا تھا کہ اگر آپ مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا حکم دیں تو یہ کام میں آسانی سے سرانجام دے لوں گا مگر قرآن کی تدوین مجھ پر اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

قرآن کریم کی چھوٹی سورتوں کی تلاوت میں نماز کے دوران ایک نظم پہلے سے ضرور موجود تھا مگر بڑی سورتوں کی ترتیب پہلی بار حضرت عثمان غنی کے زمانہ میں تدوین کے وقت ہی ہوئی، کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق کے زمانہ جمع کے وقت صحابہ کرام سے سورتوں کو صرف جمع

1- Turkish Revolution" by Jelal Nouri Bey's p.no. 32 "

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

ہی کیا جا سکتا تھا، جس ترتیب سے کہ وہ اُس وقت وصول ہو رہی تھیں جن میں اُس وقت کوئی ترتیب دی جانی ممکن نہیں تھی۔

صحابہ کرام میں یہ خیال صرف حضرت عمر ہی کا تھا کہ قرآن کو حفاظت کی غرض سے جمع کر لیا جائے۔ حضرت عثمان غنی کو بھی اس کی حفاظت کی غرض سے دوبارہ مرتب کرنے کا کوئی ذاتی شوق نہ تھا، آپ نے محض اختلاف قرأت کو ختم کرنے کے لئے وہ بھی دوسروں کی توجہ دلانے پر کچھ سرکاری نسخے جاری کیے تھے۔

جہاں تک حضرت اُبی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا تعلق ہے تو ان حضرات کا بھی قرآن کو کسی اپنی ترتیب سے لکھ لینے کا خیال اپنے طور پر ذاتی شوق کی بنا پر ہی تھا۔ کسی حکم خداوندی یا ارشاد نبوی کی بنا پر نہیں تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اُبی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود جیسے محترم حضرات کے مصاحف کی موجودگی میں، جو حضور کی سند بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے، حضرت عمر کو جمع یا تحفّظ قرآنِ کی فکر کیوں دامن گیر ہوئی؟ جبکہ آنحضرت خود بھی اپنی زندگی میں مکمل قرآن کریم کی کتابت کرا چکے تھے، اور وہ مدینے میں موجود بھی تھی! اگرچہ ہمیں قرآن و حدیث سے اس کی غرض و غایت کا کچھ علم نہیں ہو سکا کہ آپ وہ کتابت کس مقصد کے لئے کرایا کرتے تھے؟ اگر مقصد حفاظت تھی تو پھر اُس کی موجودگی کے باوجود اُسے بے اثر کس نے اور کیوں بنایا؟

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی صاف الفاظ میں نئی جمع ہونے والی "قرآن نامی کتاب" کے تحفظ کا ذکر کہیں نہیں کیا، کیونکہ اُس وقت تک قرآن کریم نے کوئی واضح شکل بھی اختیار نہیں کی تھی کہ جس کی طرف "لَہٗ" کی ضمیر راجع ہو۔ جس آیت یعنی (سورہ الحجر:۹) میں تحفظ کا ذکر آیا ہے جس کی ترتیب نزول ۵۴ ہے، وہ تو مکہ کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا اشارہ اسی غیر مکتوب آیات کی طرف تھا تو یہ اعلان بہت ہی قبل از وقت تھا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اُس وقت تک باقاعدہ رسالت کے منصب پر عملاً فائز نہیں کیا گیا تھا، آپ اُس وقت تک صرف نبوت کے منصب پر ہی فائز تھے۔ اس لئے کہ عام خیال یہی ہے کہ رسالت

شریعت کے ساتھ مشروط ہے اور آپ پر شریعت کا نزول مدنی زندگی کے بعد سے شروع ہوا۔ اُس وقت آپ کو صرف بتایا گیا تھا کہ "اِنَّا سَنُلقِیٰ عَلَیکَ قَولاً ثَقِیلاً" (۷۳:۵) ہم آپ پر ایک وزنی کلام (کو لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری) ڈالیں گے۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مکی زندگی میں اکثر کچھ پڑھنے کو کہا تھا، آپ کی مکی زندگی کا یہ وہ دور تھا جب آپ پر ابھی وحی آنا شروع ہی ہوئی تھی اور کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا، اس لئے یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اِنَّا نحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّالَہٗ لَحٰفِظُونَ" بے شک ہم ہی نے ذکر کو نازل کیا اور بے شک پھر ہم ہی اُس کے نگہبان ہیں" (۱۵:۹) اس آیت کریمہ میں لفظ ذکر مبہم ہے، اس لئے اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، ایک معنی (قرآن نام کی کسی کتاب کی غیر موجودگی میں) آپ کے قومی اور خاندانی تذکرہ کی حفاظت کے بھی ہو سکتے ہیں جو آج تک محفوظ ہے۔

کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کے مجموعہ کا ایک عرصہ تک کسی نے کوئی مستقل نام تجویز نہیں کیا تھا جسے معروف عام کہا جا سکے۔ جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے کہ "مظفّری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر نے جب قرآن کو جمع کیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اس کا کوئی نام رکھو، بعض لوگوں نے اس کا نام انجیل تجویز کیا، مگر اکثر نے اسے ناپسند کیا پھر کسی نے، سفَر نام رکھنے کی صلاح دی وہ بھی اس لئے ناپسند ہوئی کہ یہودی لوگ اپنی کتاب کا یہ نام رکھتے ہیں۔ آخر میں مسعود نے کہا" میں نے حبش کے ملک میں ایک کتاب دیکھی ہے جس کو لوگ مصحف کہتے ہیں، لہٰذا قرآن کا نام مصحف رکھ دیا گیا[2]" اگر اللہ تعالیٰ نے اس کا نام پہلے سے قرآن تجویز کر دیا ہوتا تو لوگ ہرگز ایسی جستجو میں نہ پڑتے۔ نزولِ قرآن کے مکمل ہونے اور خلافتِ راشدہ کے قائم ہونے تک اس کتاب کا کوئی مستقل نام نہ ہونے کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات سے اکثر یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لفظ قرآن کہنے سے کس وقت کیا مطلب لیا گیا ہے، کیونکہ خود

2- الاتقان، حصّہ اوّل، ص ۱۳۷

قرآن میں اس کتاب کو اکثر صفاتی ناموں سے ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے قرآن کریم سے اس کتاب کے لئے اخذ کردہ ناموں کی ایک طویل فہرست مہّیا کی ہوئی ہے۔ صاحب اتقان نے ان کی تعداد ۵۵ بتائی ہے[3]۔

رسول اللہ کے لئے نازل ہونے والی وحی یا کتاب کے لئے لفظ قرآن بطور اسم معرفہ پہلی بار کس آیت میں نازل ہوا شاید کسی کو بھی معلوم نہیں جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ آئندہ یہ نام بطور صحیفہ محمد استعمال ہو گا۔ سورہ البقرہ کی پہلی آیت میں بھی مبہم انداز اختیار کیا گیا ہے یعنی " ذٰلِک اَلکِتٰبُ " قیاس غالب یہی ہے کہ یہاں اس سے مراد صحیفہ محمد ہی ہے۔ لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے وہ واضح الفاظ میں قرآن نہیں بلکہ اُس کا نام ذکر بتایا گیا ہے جو آپ کے مقصد بعثت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر یہ اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تینوں آسمانی کتابوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے جو اولادِ ابراہیم پر نازل کی گئیں کیونکہ اس سے پہلی دونوں کتابوں کو اللہ تعالیٰ کے "اذکار" سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم کو مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے موجودہ شکل تک پہنچنے میں بہت طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اسے اپنی نگرانی میں مختلف اجزاء، مثلاً لکڑی کے ٹکڑوں، پتھر وں، ٹھکریوں، چمڑے کے ٹکڑوں، اونٹ کے شانوں کی ہڈیوں، پتوں، اور درخت کی چھالوں وغیرہ پر لکھوایا تھا۔

قرآن کریم کی تدوین کے چار دور ہیں، پہلا وحی اوّل بزمانہ مکہ سے وفاتِ نبوی تک کا دور ہے جس میں خود رسول کریم کا اپنا ذخیرہ کتابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ کے مصاحف ہیں، دوسرا حضرت ابو بکر صدیق سے حضرت عثمان کی تدوین سے قبل کا، تیسرا حضرت عثمان غنی کا، اور چوتھا حضرت عثمان کے بعد عبدالرحمٰن خلیل بن احمد ۱۷۰ھ تک کا ہے جو تاریخ تدوینِ قرآن میں اصل مخطوطات کی حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

علامہ تمنّا عمادی پھلواروی کی کتاب "جمع القرآن" کے مطابق جیسا کہ آپ مصحفِ اسطوانہ

3- ایضاً، ص ۱۳۳۔ ۱۳۴، از علامہ جلال الدین سیوطی

کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ وقت کی (ہر) نازل شدہ آیات کو اُس "کتاب" (جس کا ثبوت تاریخ کی کسی کتاب سے نہیں ملتا) میں جس کا نام امام اور اُمّ تھا، جو پہلے مسجدِ نبوی بننے کے بعد اس کے ایک ستون کے پاس ایک صندوق میں محفوظ رہتی تھی، لکھوا دیا کرتے تھے، اس لئے اُس ستون کو "اسطوانۂ مصحف" کہتے تھے۔ صحابہ اسی کے پاس بیٹھ کر قرآن یاد کیا کرتے تھے۔ اور کتاب الامام سے قرآن اپنے مصحفوں میں نقل کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ خود حضرت زید بن ثابت ہی سے مروی ہے کہ "ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس (بیٹھ کر) رقعوں سے یعنی اوراق سے (قرآن) جمع کیا کرتے تھے[4]۔" یہاں علامہ نے کتاب کے بجائے رقعوں پر سے لکھ دیا ہے جنہیں کتاب نہیں کہا جا سکتا جن سے مراد شاید وہی متفرق اشیاء ہوں جن پر قرآن شروع میں لکھا جاتا تھا، یا پھر یہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا ذخیرہ ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس حوالے سے حیاتِ نبوی تک قرآن کریم کے کم از کم دو سرکاری نسخوں کا موجود ہونا ضروری ہے جن میں سے ایک تصحیح اور مرتب شدہ اور ایک متفرق اشیاء پر لکھا ہوا، ورنہ صرف ایک ہی۔ بعض دوسری کتابوں سے بھی ایسا تاثر ضرور ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک مکمل اوراق پر لکھا ہوا قرآن اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں صحابہ کرام کے ذاتی نسخے بھی موجود تھے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ نے آیت میں یہ جو فرمایا "اِنَّا نحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّالَہٗ لَحٰفِظُون" اس کی جگہ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ "جو "ذکر" ہم آپ پر نازل فرما رہے ہیں اس کی حفاظت بھی ہم خود ہی کریں گے" اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے ایک عام بات کہی ہے کہ "بے شک ہم ہی نے ذکر (نصیحت وہدایت) کو نازل کیا اور بے شک پھر ہم ہی اُس کے نگہبان ہیں" (۱۵:۹)

تمنا عمادی صاحب کے برخلاف امام ابن تیمیہ اپنی کتاب "الصراط المستقیم" میں بدعات کے ذکر کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

"اس طرح کی بہت سے مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کا جمع کرنا۔ عہد نبوی میں قرآن جمع نہیں کیا گیا، کیونکہ وحی کا سلسلہ جاری تھا، اور احکام میں اللہ کی طرف سے تبدیلی ہوتی رہتی تھی،

4- بحوالہ مستدرک حاکم، واتقان، جلد ۱، ص ۸۱، اور فتح الباری، جمع القرآن، ص ۱۷۰۔۱۷۱

اگر کتاب کی شکل میں قرآن جمع کر دیا جاتا تو ہر وقت تبدیلی میں مشکل پیش آتی، لیکن جب آپ کی وفات کے ساتھ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور شریعت ایک نہج پر قائم ہو گئی تو قرآن کو جمع کر لیا گیا۔ صحابہ کرام کا یہ فعل لغۃً بدعت تھا، مگر شرعاً نہیں، کیونکہ سنت نبوی کے عین مطابق تھا۔[4]

بقول جناب جسٹس سید امیر علی " پیغمبر اسلام ﷺ نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ (ایک) نیم متمدن اور پُرانی وضع کے معاشرے کی ضروریات پر مبنی تھے.... قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے وہ بھی ایسے تھے کہ اُن کی تعمیل (بھی اس وقت و) حالات کے مطابق کی جاسکتی تھی[5] اس رائے کے بعد اُن کی حفاظت تعمیل احکام کے لئے بعد کے زمانوں کے لئے بے معنی تھی۔

دوسرے اگر اس کے معنی کلام الٰہی لئے جائیں تو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کہیں بھی آپ کی طرف نازل کی جانے والی وحی کا کوئی ایک خاص نام تجویز نہیں کیا اس لئے "لَہٗ" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے تمام کلام کی طرف راجع ہونی چاہئے۔ اور اللہ اُس میں سے جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے بُھلا دیتا ہے یا منسوخ فرما دیتا ہے۔

لفظ قرآن کے بارے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ اسم ہے یا فعل، اس کے علاوہ جن ناموں سے لوگوں نے قرآن میں وارد تقریباً ۵۵ ناموں کو وحی رسول اللہ کے لئے نازل ہونے والی کتاب کے نام سمجھا ہے، اس کی ایک طویل بحث صاحبِ اتقان نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ ن تمام ناموں میں سے تحفظ دیئے جانے کے لئے جس خاص نام کا اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجر میں انتخاب کیا وہ "ذکر" ہے۔ اس لفظ کے بارے میں علامہ سیوطی فرماتے ہیں (اس کا) "ذکر" یوں نام دیا گیا کہ اس میں نصیحتیں اور گزشتہ قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ذکر عزت کو بھی کہا جاتا ہے (جیسا کہ) خداوند کریم فرماتا ہے، "وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ" (۴۳:۴۴) "بے شک یہ ذکر (قرآن) آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے موجب

4- صراط مستقیم از امام ابن تیمیہ اردو ترجمہ جادہ حق از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۴۱

5-روح اسلام، ص ۶۲۵، (اردو) انگریزی، ص ۴۳۶

عزت ہے[6]" کیوں کہ اس میں آپ کے خاندان اور قوم کا ہی ذکر مذکور ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہ لفظ "ذکر" خواہ عزت کے معنی میں آیا ہو یا نصیحت کے یا تذکرہ کے یا پھر بطورِ اسم قرآن کے، اس کا تمام تر تعلق ہمیشہ عرب قوم سے ہی رہا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی آیات کا جمع ہونا یا محفوظ رہنا سب عرب قوم اور معاشرے کے لئے تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ اُن کے لئے ایک ادبی سرمایہ تھا جس میں عرب جاہلیہ کی لغت اور اسلوبِ بیان کے بیش بہا نمونے محفوظ ہو گئے تھے اور ایک نیا اندازِ بیان بھی عطا ہوا تھا جس کے ایک جملے کی مثل بھی پیش کرنا تمام اُدَباء عرب کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتا تھا۔

جمع القرآن کی تفصیلات میں اختلافات پائے جاتے ہیں، چنانچہ علامہ تمنّا عمادی کا "جمع القرآن" لکھنے کا مقصد ہی جمع القرآن سے متعلق تمام روایات کو موضوع قرار دینا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> "جمع القرآن کی جو اصل روایت ہے جس پر اس وقت تمام لوگوں کا اعتماد ہے، وہ تو وہی ہے جو بخاری، ترمذی و نسائی میں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں قرآن کسی کتاب کی صورت میں یکجا مجتمع نہ تھا بلکہ ٹھیکری، ہڈی، چھال وغیرہ پر منتشر آیتیں لکھی ہوئی تھیں.... حافظوں کی جماعت میں سے ایک بڑی جماعت جنگ یمامہ میں شہید ہو گئی جن کو قرآن کے بہت سے حصّے یاد تھے۔"[7]

ان روایتوں کے بارے میں آپ فرماتے ہیں:

> "بہر حال روایتیں تو جمع القرآن کے متعلق سب کی سب موضوع ہیں اس لئے (مجھے) اس سے بحث نہیں[8]۔"

اس طرح رسول اللہ کے بعد قرآن کریم کے دو نسخوں، یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود اور

6- الاتقان، حصّہ اوّل، ص ۱۳۶، (اردو) مطبوعہ ادارۂ اسلامیات، لاہور
7- جمع القرآن، ص ۹۷
8- ایضاً، ص ۲۷۹

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

حضرت ابی بن کعب، کے علاوہ سب سے پہلا حضرت ابو بکر صدیق کا جمع کردہ نسخہ، اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کے عہدِ رسالت کے مکمل اور غیر مکمل بے شمار نسخے موجود تھے۔ ان سب کے بعد حضرت عثمان غنی کے چھ مصاحف آتے ہیں جن کی آیات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کہتے ہیں کہ کوفی نسخے میں ۶۲۳۶، بصری نسخے میں ۶۲۱۶، شامی نسخے میں ۶۲۵۰، مکی نسخے میں ۶۲۱۲، مدنی نسخے میں ۶۲۱۴ جبکہ موجودہ نسخے میں ۶۶۶۶ آیاتِ مبارکہ ہیں[9]۔ اس طرح کل تعداد آٹھ یا نو معروف نسخے تاریخ میں ملتے ہیں۔

پھر ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ حجاج بن یوسف نے جس قرآن پر پہلی بار زیر، زبر، پیش اور نقطوں کی علامات لگوائی تھیں وہ کوئی نئی نقل تھی یا کسی پرانے نسخے پر ہی لگائی گئی تھیں اور خود وہ قرآن آج کہاں ہے؟ ان سب کی دستاویزی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی غیر موجودگی کے باوجود بھی قرآن کے بارے میں شاید ہی کسی صاحبِ ایمان شخص کے دل میں کوئی شک وشبہ موجود ہو لیکن اگر کسی چیز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ثبوت موجود ہوں تو یہ اُس کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

اس وقت سوائے حضرت عثمان غنی کے ایک یا دو نسخوں کے علاوہ جو تاشقند کی کسی مسجد اور ترکی کے توپ کاپی عجائب گھر میں محفوظ ہیں باقی تمام ایسے اہم اور مقدس نسخوں کا کیا ہوا کسی کو صحت کے ساتھ کچھ معلوم نہیں۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر ان میں سے بعض نسخے آج بھی کہیں موجود ہوں تو ان کا علم عام مسلمانوں کو بھی ہونا چاہئے، تاکہ جہاں بھی وہ ہوں ان کی بہتر حفاظت کی جاسکے۔

البتہ ان میں سے علامہ تمنّا عمادی نے اپنی کتاب جمع القرآن میں صرف حضرت حفصہ والے صحیفے کے راز پر سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں، "حضرت حفصہ کے پاس سے وہ صحیفے پھر کیا ہو گئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر صاحبِ عقل کے دماغ میں ضرور پیدا ہو کر رہتا ہے۔ مگر افسوس کہ حسب روایت بخاری، ترمذی، نسائی، ابن شہاب بس یہاں تک کہہ

9-مفتاح القرآن، مرتبہ جناب محمد مظہر الدین ملتانی ص ۸۰ (اشاریہ)

کر چپ ہو جاتے ہیں کہ وہ صحیفے جن کو حضرت صدیق اکبر نے زید بن ثابت سے جمع کرایا تھا، صدیق اکبر کے بعد حضرت عمر کو ملے اور حضرت عمر کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنتِ عمر کے پاس چلے آئے اور اُنہیں کے پاس برابر رہے، یہاں تک کہ حضرت عثمان کو جب نقل مصحف کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُن صحیفوں کو حضرت حفصہ کے پاس سے اُنہوں نے مستعار منگوا کر اور اُن کی متعدد نقلیں کرا لینے کے بعد پھر ان صحیفوں کو حضرت حفصہ کے پاس ہی واپس کر دیا۔..... پھر وہ صحیفے حضرت حفصہ کے بعد کیا ہو گئے؟ آسمان پر اٹھا لئے گئے یا زمین اُن کو نگل گئی؟ نہ زید بن ثابت نے اس کو عبید بن السباق سے کہا، نہ عبید نے زید سے پوچھا، عبید ابن شہاب سے کہا، نہ ابن شہاب نے اپنے شاگردوں سے کہا، نہ ان میں سے کسی نے ابن شہاب سے، یہاں تک کہ امام بخاری کو (بھی) اپنے شیوخ سے اس کے پوچھنے کی ضرورت مطلق محسوس نہ ہوئی[10]۔

علامہ تمنّا عمادی رواہ ابن ابی داؤد کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"حضرت حفصہ کے صحیفوں کا حال ابن شہاب زہری جانتے تھے۔ یعنی زہری کہتے ہیں کہ مجھے سالم بن عبداللہ نے خبر دی کہ مروان (بن الحکم بن ابی العاص) حضرت حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کرتے تھے اُن صحیفوں کو مانگنے کے لئے، تو حضرت حفصہ اُن کو دینے سے انکار کرتی تھیں، تو جب حضرت حفصہ وفات پا گئیں اور ہم اُن کے دفن سے واپس آئے تو مروان نے پورے ارادے کے ساتھ عبداللہ بن عمر کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ اُن صحیفوں کو ان کے پاس بھیج دیں تو وہ صحیفے بھیج دئے گئے، تو مروان نے اس کو پرزے پرزے کر دینے کا حکم کیا۔ اور کہا کہ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس میں ہے وہ لکھا جا چکا اور مصحف محفوظ ہو چکا۔ تو میں ڈرا کہ لوگوں پر زمانہ جب دراز ہو جائے گا تو کوئی شکی مزاج اس مصحف کی شان میں (جو لوگوں کے پاس ہے) شک نہ کرنے لگے یا کہے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز تھی جو نہیں لکھی گئی[11]۔"

10- جمع القرآن، ص ۲۶۱۔ ۲۶۲

11- ایضاً، ص ۲۶۵، بحوالہ کنز العمال، جلد ۱، ص ۸۲۰، از علامہ تمنّا عمادی مجیبی بھلواروی

علامہ تمنّا عمادی مروان کے اس فعل کو مروان کی دور اندیشی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مروان غریب نے اپنے زمانے میں منافقینِ عجم کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیا اور صحیح محسوس کیا کہ آگے چل کر یہ مصحفِ نبوی (صدیق اکبر والے) معلوم نہیں کس کس کے ہاتھ لگے اور کب منافقین کو اس میں کچھ کمی بیشی کا موقع مل جائے اور پھر یہ اصل مصحفِ نبوی میں تحریف کر کے عامّہ مسلمین کے پاس جو مصاحف ہیں اُن صحیفوں کی آیات اور سورتوں کو دکھا کر سب برباد کر دیں، اس لئے اُن کا ضائع کر دینا ہی عین مصلحت تھی... حقیقت یہ ہے کہ مروان بن حکم[12] کی یہ نہایت پر حکمت دور اندیشی تھی۔"[13]

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

(اس کے برعکس خوش اندیش کو عیب بھی ہنر نظر آنے لگ جاتے ہیں)

سب سے پہلی ایمان کی کمزوری تو یہ ہے کہ جس قرآن یا اپنے ذکر کی حفاظت کا ذمّہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہو اُس کا منافقین عجم تو کیا تمام دنیا کے بد اندیش مل کر بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چنانچہ جس قدر اور جس وقت تک اللہ نے چاہا وہ اُس وقت تک بفضل تعالیٰ محفوظ رہا اور آج بھی محفوظ ہے۔ دوسرے اگر عربوں کی اتنی بڑی اور طاقتور سلطنت بھی اُس اصل اور مقدس ترین متاع عظیم کی حفاظت سے عاجز تھی تو پھر ان کی زمین پر کسی بھی قسم کی ضمانت کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ تیسرے اُن دستاویزی مصاحف کی اپنی ایک انمول قدر و قیمت تھی۔ چوتھے جسے دیکھ کر اہلِ ایمان کی آنکھیں تا قیامت ایک نا قابلِ بیان سکون بھی حاصل کر سکتی تھیں اُسے مروان کی فراست نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دیا۔

یہ تو حضرت ابو بکر صدیق کے جمع کردہ مصحف کی داستان تھی جسے علامہ تمنّا عمادی مصحف

12- یہ وہی مروان ہیں جنہیں رسول اللہ نے منافقت اور جاسوسی کے الزام میں جلاوطن کر دیا تھا اور رسول اللہ کے بعد دونوں خلفاء راشدین نے اپنے دور حکومت میں اس سزا کو قائم رکھا تھا، مروان حضرت عثمان غنی کے چچیرے بھائی اور داماد تھے۔ (جزیرۃ العرب، ص ۱۰۷ از جناب پروفیسر محمود بریلوی)

13- جمع القرآن، ص ۲۶۵۔۲۶۶

نبوی کہتے ہیں۔ جس پر کہتے ہیں کہ بعد میں حضرت عمر نے بھی کچھ کام کیا تھا۔ باقی رہا خود رسول کریم کی اپنی نگرانی میں ایک مکمل، اور شاید باقی متفرق اجزاء پر لکھی ہوئی آیات کا ذخیرہ جن کے بارے میں تاریخ اسلام ہمیشہ سے مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ ان کے علاوہ حضرت عثمان غنی کے باقی چار یا پانچ مصاحف جو مدینہ کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھیجے گئے تھے اُن کا کیا حال ہوا؟ یہ بھی کسی کو پتہ نہیں۔ نیز جناب حجاج بن یوسف نے جس قرآن پر کچھ نقطے اور علامتیں لگوائی تھیں وہ اصل قرآن کہاں غائب ہو گیا اس کا بھی ذکر تاریخ کی کتابوں میں ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ ان کے بعد خلیل بن احمد المتوفی ۱۷۰ھ نے حجاج کے بعد جو بالکل ہی نئی اور مروجہ اصلاحات رائج کیں اُس اصل کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب صرف ایک نسخہ جسے حضرت عثمان غنی کی شہادت کے وقت آپ کے زیرِ مطالعہ ہونا بتایا جاتا ہے اُس کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہو سکی ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ترکی کے عجاب گھر میں جو مصحف محفوظ ہے، وہ کس صوبے کا ہے، اور کیا وہ بالکل محفوظ اور مکمل بھی ہے؟ بہر حال حضرت عثمان غنی کی شہادت کے وقت زیر مطالعہ مصحف پر اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اس وقت پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے، روزنامہ "امت کراچی" میں ایک مضمون "مسلمانوں کی بے خبری، قرآنی مخطوطات کی نیلامی" چھپا تھا جس میں لکھا تھا "لندن میں نوادرات نیلام کرنے والے مشہور ادارے کرسٹی (Christe) ..... کے ایک ترجمان نے تصدیق کی ہے کہ فروخت میں رکھے جانے والے قرآن مجید کے اوراق شاید اُسی نسخے کا حصّہ تھے جو تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ کرسٹی کی ترجمان خاتون وکٹوریہ کوڈ، کا کہنا ہے کہ ہمارے ادارے نے جو اوراق .... فروخت کئے تھے شاید وہ اُسی مصحف سے لئے گئے تھے جو حضرت عثمان کے زمانے (۶۴۶ء۔ ۶۵۶ء) میں موجود تھا اور جس پر خون کے نشانات تھے،... حضرت عثمان کا قرآن مجید جس کے کل ۷۰۶ صفحات تھے اب چودہ سو سال میں آدھا رہ گیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں

ازبکستان کے اسلامی امور کے ادارے نے اس نسخے سے پندرہ اوراق چوری کرنے کے الزام میں ایک نوجوان کو گرفتار کیا تھا، لیکن اُن گم شدہ مقدس صفحات کا سراغ نہیں مل سکا۔

لندن کے اس نیلام گھر کا کہنا ہے کہ جو اوراق اُس نے فروخت کئے ہیں اُن کا تعلق (کم سے کم) ۱۹۹۲ء میں چوری کئے جانے والے صفحات سے نہیں تھا۔

برطانیہ میں ازبکستان حکومت کے ایک ترجمان نے کرسٹی کے موقف کی تائید میں کہا ہے کہ فروخت کئے جانے والے صفحات کے نمبر چوری ہونے والے اوراق سے مختلف تھے۔ تاہم برطانیہ کے اسلامی اسکالرز نے ازبکستان میں ان اوراق کی گمشدگی اور لندن میں فروخت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اُن تمام افراد سے اپیل کی ہے جن کے پاس اس عثمانی مصحف کے اوراق ہیں، وہ انہیں واپس کر دیں۔[14]

بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ میں حضرت عثمان کے مرتب کردہ دو قرآن تھے۔ ایک مدینہ کے مسلمانوں کے لئے اور ایک حضرت عثمان کا ذاتی، جس کے بارے میں علامہ محمد زاہد الکوثری (متوفّٰی ۱۳۷۱ھ) فرماتے ہیں:

> "جہاں تک حضرت عثمانؓ کے مصحف خصوصی کا تعلق ہے جو انہوں نے اپنے لئے رکھا تھا، جو ابو عبید نے کسی لائبریری میں دیکھا تھا جیسا کہ "العقیلۃ" اور اس کی شرح میں ہے، تو ممکن ہے کہ یہ وہی مصحف ہو جس کا ذکر علامہ مقریزی (۱۳۳۴ء۔ ۱۴۴۲ء) نے "الخطط المقریزیہ" میں جامع عمرو کے مصحف اسماء کے ضمن میں کیا، یہ وہی نسخہ ہے جس کے بارے میں عبد العزیز بن مروان نے اعلان کیا تھا کہ جو اس میں غلطی نکالے گا اُسے بڑا انعام دیا جائے گا اور نتیجتاً کوفہ کے ایک قاری نے "نعجۃ" (ص:۲۳) کے بجائے "نجعۃ" کی ایک غلطی نکالی تو اُسے وہ انعام مل گیا۔ پھر وہ مصحف دیگر آثار نبویہ کے ساتھ ملکِ غور کے قبہ کو منتقل کیا گیا اور بعد میں وہیں یہ آثار قدیمہ مشہد میں منتقل ہوئے۔"
> (وثوق سے تو نہیں، لیکن خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ اب بھی وہیں ہو)

14. روزنامہ، امت، کراچی، ۱۷ دسمبر ۱۹۹۶ء

خون آلود مصاحف

علامہ شیخ نجیت نے "الکلمات الحسان" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

بہت سے فریب کار بڑی جسارت سے بعض قدیم مصاحف کو خون آلود کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ وہی مصحف ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت اُن کے پاس تھا۔ اس قسم کے کئی خون آلود مصاحف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن فریب کاروں سے انتقام لیں گے۔[15]

مصحف عثمانی (مدینہ) کے بارے میں شاطبی (وفات ۷۹۰ء) اپنے قصیدہ رائیہ میں فرماتے ہیں:

"امام مالک نے فرمایا کہ قرآن کو طرزِ اوّل پر (غالباً ترتیب نزول کے مطابق) لکھا جائے اور اس میں سے کچھ بھی قطع و برید نہ کی جائے (یعنی نسخ) اس لئے کہ مصحف امام غائب ہو گیا ہے اور ہم کو مشائخوں سے اس کی خبر ملی ہے۔ (اگرچہ) ابو عبید نے کہا کہ بعض امراء نے اپنے خزانے سے مصحف میری زیارت کے لئے منگایا اور میں نے اُس پر خون کا اثر دیکھا۔

ولد نحاس نے امام مالک کی اس روایت کو ردّ کیا کہ مصحف ضائع ہو گیا ہے مگر اہلِ انصاف نے ولد نحاس کی تردید کی کہ امام مالک نے ضائع ہونا نہیں فرمایا، بلکہ کہا کہ (مدینہ سے) غائب ہو گیا ہے۔ اور جو چیز موجود ہو اُس کا جلد یا بدیر مل جانا متوقع ہوتا ہے۔"[16]

امام مالک نے ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ ابن ابی حاتم، نافع بن ابی نعیم سے جن کی وفات ۱۶۹ ہجری میں ہوئی، روایت کی ہے کہ مصحف امام ایک خلیفہ کی زیارت کے لئے لایا گیا تھا اور میں نے بچشم خود آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ (۲:۱۳۷) پر خون کا اثر معائنہ کیا۔

جناب محمد عبد الغفور فاروقی فرماتے ہیں اس روایت سے مصحف کی موجودگی، زمانہ حیات نافع بن ابی نعیم ثابت ہوتی ہے۔ پھر حافظ ابو عمر نے مقنع میں اسناد کے ساتھ روایت کی کہ ابو عبید

15- ماہنامہ فکر و نظر، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۴۳۴۔۴۳۵، ترجمہ و تلخیص از جناب سید محبوب علی شاہ

16- حدائق البیان فی معارف القرآن، ص ۱۱۷۔۱۱۸، ناشر کاشف پبلشرز رام نگر چوبرجی، لاہور تاریخ اشاعت ۱۹۸۴ء

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

قاسم بن سلام نے کہ میرے لئے بعض خزائنِ امراء سے مصحف امام عثمان بن عفان کا نکالا گیا اور میں نے اُس میں (حضرت عثمان کے) خون کا اثر موجود دیکھا[17]" ابن حجر نے ابو عبید قاسم کو فاضل ثقہ مصنف لکھا ہے۔ اور اُن کی وفات ۳۲۴ہجری بتائی۔ ابن بطوطہ نے ایسے ہی کسی مصحف کو ۱۳۲۶ء میں بصرہ میں بھی دیکھا تھا[18]۔

جناب عبد الغفور فاروقی فرماتے ہیں کہ پس معتمد روایت سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں یہ مصحف محفوظ تھا اگرچہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کس ملک اور کس شہر میں تھا۔ محمد بن جبیر اندلسی کے سفر نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ۵۷۹ھ میں حرم مکہ معظّمہ کے اندر ایک قرآن کی زیارت کی تھی جو منجملہ خلفائے اربعہ کسی خلیفہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور اُس پر زید بن ثابت کے ہاتھ کا سن بھی تحریر تھا، وہ لمبے چوڑے ورقوں پر لکھا اور لکڑی کی دفتین سے مجلد تھا جس پر برنجی قبضے لگے تھے۔ لیکن اُس وقت بھی بہت ورق ضائع ہو چکے تھے، غالباً یہ وہی مصحف رہا ہو جو شام کو بھیجا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ پچھلے مسلمانوں کی غفلت سے ایسے آثار برباد ہوئے جن کی عزت اسلامی نگاہوں میں تاج قیصر اور کسریٰ سے (بھی) زیادہ ہونی چاہئے تھی[19]۔

اسی طرح جناب محمد عبد الغفور فاروقی، مصحف حضرت ابو بکر صدیق کے بارے میں لکھتے ہیں "وہ مصحف حضرت حفصہ کے پاس محفوظ تھے مگر بعد ان کی وفات کے مروان بن حکم کو جو معاویہ کی طرف سے حاکم مدینہ تھا، یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید امتدادِ زمانہ کے بعد ان صحائف سے صورت فساد کی کھڑی ہو اس لئے اُس نے اُن سب کو چاک کر دیا، پس مصحف کے لفظ سے اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ مصحف ابو بکر صرف ایک مجموعہ اوراق منتشر کا تھا[20]۔" (یعنی کسی بھی خاص ترتیب سے مدوّن نہیں تھا کہ جس کی پیروی عثمان غنی کرتے) مروان بن حکم کو حضرت عثمان نے حضور ﷺ کی دی ہوئی جلاوطنی کی سزا معاف فرما کر اپنا سیکریٹری بنالیا تھا، جس سزا کو

17- ایضاً، ص ۱۱۸

18- تاریخ شام، ص ۳۴۵ (حاشیہ) از ڈاکٹر فلپ کے حتی

19- حدائق البیان فی معارف القرآن، ص ۱۱۹۔۱۲۰

20- ایضاً، ص ۱۷

آپ سے پہلے دونوں خلفاء راشدین نے قائم رہنے دیا تھا[21]۔ اس طرح خاندان بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت عثمان کے خود نقل کردہ مصاحف کے علاوہ دور اوّل کے تقریباً تمام کے تمام مصاحف تلف ہو گئے۔ خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے باقی ماندہ مصاحف کو بعد کے مسلمانوں نے اوراق چر اچر اکر ادھورے کر ڈالا۔

علامہ شیخ حسین بن محمد بن حسن دیار بکری، تاریخ خمیس میں لکھتے ہیں کہ جمعہ اوّل شہر رمضان ۶۵۴ھ میں اتفاقیہ مسجد نبوی میں آگ لگی اور تمام سامان مع اس کی چھتوں کے جل گیا لیکن وہ قبہ جس کو ناصر الدین لِلّٰہ نے بنایا تھا ببرکت مصحف عثمانی وبایں سبب کہ صحن مسجد میں واقع تھا بچ گیا۔ پس اس روایت سے ثبوت مل گیا کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی یہ مصحف محفوظ اور احاطہ مسجد نبوی میں موجود تھا۔[22]

آخر میں جناب محمد عبد الغفور فاروقی اپنے ایک ذاتی خط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ہر چند مجھے اب تک زیارت حرمین شریفین کی عزت حاصل نہیں ہوئی لیکن مولانا محمد سعید منتظم مدرسہ صولتیہ واقع مکہ معظّمہ کے خط مورخہ ۱۸ ماہ صفر ۱۳۲۵ ہجری سے مجھ کو ثابت ہوا ہے کہ بحمد اللہ (کوئی ایک نسخہ) مصحف عثمانی اب تک مدینہ منورہ میں محفوظ ہے اور ساکنانِ بلدۂ طیبہ کو جب قحط یا کسی دوسری مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو اُس کو نکال کے پڑھتے اور خداوند عالم سے التجا واسطے حل مشکلات کے کرتے ہیں۔ مولانا محمد سعید لکھتے ہیں کہ تقریباً چالیس برس کا زمانہ گذرا کہ یہ مقدس مصحف خزینہ برکات سے نکالا گیا تھا۔ واقعات پر نظر کر کے یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ چند روز یہ مصحف مدینہ منورہ سے باہر خزائن اُمرائے اسلام میں رہا اور پھر کسی نیک دل کو خدا نے توفیق دی اور اُس نے مصحف مذکورہ کو مدینہ شریف میں پہنچا دیا الحاصل کچھ شک نہیں کہ مصحف موجودہ اُنہی مصاحف سبعہ میں سے ہو جو بعہد حضرت عثمان لکھے گئے تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ وہ نسخہ نہ ہو جو بروقت شہادت اُن کے روبرو موجود تھا۔ آپ لکھتے ہیں باقی چھ مصحف کیا ہوئے اُن کا

21- دیکھئے، جزیرۃ العرب، ص ۱۰۷، از جناب پروفیسر محمود بریلوی سابق ڈائریکٹر المؤتمر الاسلامی، نیز سیر الصحابہ جلد اوّل، خلفائے راشدین، ص ۱۹۵ اور ۲۰۱

22- حدائق البیان فی معارف القرآن، ص ۱۱۹

ٹھیک پتہ معلوم نہیں ہوتا، البتہ سنا جاتا ہے کہ اُن میں کا ایک نسخہ کتب خانہ روس میں اب تک موجود ہے، واللہ عالم بالصّواب ۔[23]

ان کے علاوہ جو سب سے اعلیٰ و ارفع ذخیرہ مختلف اشیاء پر مصاحف کی صورت میں خود رسول کریم کی خاص نگرانی میں ایک عرصہ دراز سے جمع ہو رہے تھے، جو کوفی خط کی ایجاد سے پہلے تحریر میں آئے۔ جس کے بارے میں جناب عبد الصمد صارم الازہری لکھتے ہیں:

"مکہ میں بنی ہاشم میں 'خطِ قیر اموز' رائج تھا، اس لئے مکہ میں (قرآن کریم کی) جس قدر کتابت ہوئی وہ اسی خط میں ہوئی، مدینہ میں جو کتابت ہوئی وہ خطِ حیری میں ہوئی ۱۶۰ ھ سے خطِ کوفی میں کتابت ہونے لگی۔ (اس لئے مصاحفِ عثمانی کی کتابت بھی خطِ حیری میں ہی ہونی چاہئے) اور ۳۱۸ھ میں خطِ نسخ میں کتابت ہونے لگی، اور اس پر ہی اجماعِ امّت ہو گیا۔ اب اس کے خلاف جائز نہیں۔[24] آپ ہی لکھتے ہیں، وزیر ابن مقلّہ ۳۳۸ھ نے خطِ کوفی میں اصلاح کر کے خطِ نسخ ایجاد کیا جو آج تک رائج ہے۔[25]

خطِ قیر اموز اور خطِ حیری میں جس قدر کتابت رسول اللہ نے کرائی تھی جس میں وہ تمام منسوخ ذخیرہ آیات بھی موجود ہو گا، جو بوجہ منسوخ ہو جانے کے جمع اوّل حضرت ابو بکر صدیق کے مصحف میں نہیں لکھا گیا تھا، اس سے پہلے رسول اللہ کے زمانے کا تمام منسوخ اور غیر منسوخ شدہ قرآن کیا ہوا؟ اُس کے اتلاف یا محفوظ کئے جانے کے بارے میں تاریخ اسلام کی تمام کتابیں مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جو ہمارا سب سے مقدّس سرمایہ تھا۔ اُن میں کا کوئی ایک بھی چمڑے کا ٹکڑا، ہڈی، پتّہ، پتھر یا درخت کی چھال کا نمونہ ہماری زیارت کے لئے آج دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جن میں منسوخ اور غیر منسوخ آیات سب ہی موجود تھیں بلکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ منسوخ آیات اب کتبٍ مَّکنُون میں بھی محفوظ ہیں یا نہیں، جن کی شاید

23- حدائق البیان فی معارف القرآن، ص ۱۱۹
24- تاریخ القرآن، ص ۲۹، نیز دیکھئے اسی کتاب کے صفحات ۸۸، ۲۱۶، اور ۲۱۸
25- تاریخ القرآن، ص ۹۱

قرآن میں اس وقت موجود منسوخ آیات کی طرح حالات کے تحت آئندہ زمانے والوں کو بھی ضرورت پیش آسکتی ہو جس طرح پہلے ضرورت پیش آئی تھی، کیونکہ موجودہ منسوخ آیات کے بارے میں نسخ فی القرآن کے منکر اِن کا اب یہی جواز پیش کرتے ہیں، کہ یہ اُن جیسے حالات میں دوبارہ بھی قابلِ عمل ہو سکتی ہیں۔

مصحفِ بیبرس یا نسخۂ سمرقندی

اس کے بارے میں علامہ محمد زاہد الکوثری فرماتے ہیں:

> رہا وہ مصحف جس کو الملک الظاہر بیبرس نے شمال میں "وولجا" اور اُس کے مضافات میں مغل بادشاہوں کو تبلیغ کے لئے ارسال کیا تھا، اگر چہ اُس کی ممالک میں شہرت ہوگئی ہے تاہم وہ مصحفِ عثمانی نہیں۔ وہ صحابہ کے قدیم منسوخ مصاحف میں سے تھا، کیونکہ اس کا رسم الخط حضرت عثمانؓ کے خصوصی مصحف کے رسم الخط سے مختلف تھا۔

جیسا کہ علامہ شہاب مرجانی نے "وفیات الاسلاف و تحیات الاخلاف" میں مصحفِ بیبرس کے رسم الخط کا، رائیۃ رسم الخط سے متعلق تالیفات میں مندرج تفاصیل کے مطابق، مصحف عثمانی کے رسم الخط سے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ اس کی تحقیق کی ہے۔ علامہ محمد زاہد الکوثری فرماتے ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصحفِ بیبرس وہی ہے جو سلطنت شمالی منگولستان کے خاتمہ کے بعد سمرقند کی مسجدِ عبید اللہ الاحرار سمرقندی، میں محفوظ تھا اور جب پچھلی صدی میں روس نے سمرقند پر قبضہ کرلیا تو اُس مصحف کو یہاں سے قیصر روس کے خزانہ کتب میں منتقل کیا گیا اور ان کے خاتمہ تک یہیں رہا۔ (ماہنامہ، فکر و نظر، ص ۴۳۵، شمارہ، دسمبر ۱۹۷۰ء)

کہتے ہیں کہ رسمِ جہاں بانی کیلئے مغل بادشاہ اپنے پاس آئینِ چنگیزی بھی رکھا کرتے تھے، جس کا نام 'یاسا' تھا اور چنگیز خان نے بلبق نام کی ایک کتاب میں، جس میں اُس کے اقوال جمع تھے، 'یاسا' کے بارے میں اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی کہ میرے بعد جو حاکم آئیں اگر وہ 'یاسا' میں بیان کردہ اصولوں کی تھوڑی سی بھی خلاف ورزی کرینگے تو نظام حکومت بگڑ جائے گا۔

عربی کے کسی مشہور مورخ کا نام بتائے بغیر قومی ڈائجسٹ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب منگولین لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے شریعت کو اپنے قبائل کے رسم و رواج کے سانچے میں ڈھال دیا۔ خالص مذہبی امور کے لئے تو وہ قاضی القضاۃ سے دریافت کرتے تھے، مگر وہ اپنی ذات اور قبیلے سے متعلق مسائل میں چنگیز خانی 'یاسا' پر ہی عمل کرتے تھے، اور اُن امور کے لئے وہ الگ افسر مقرر کیا کرتے تھے۔[26]" جو یقیناً یاسا اور کتابِ بلبق کے عالم ہوں گے۔

کہتے ہیں کہ وہ مصحف جو صحابہ کے کسی منسوخ مصاحف میں سے تھا، زوال روس کے پندرہ سال بعد پھر جامع سمرقندی منتقل ہو گیا، لیکن وہاں کے جاہل مسلمانوں نے پوشیدہ طور پر تبرّک کے نام سے مختلف جگہوں سے بہت سے اوراق نکال لئے اور اس تاریخی (اور) عظیم القدر نادر روزگار مصحف کو پارہ پارہ کر دیا۔ (جس کے بعد) اہلِ فضل علماء نے اس کے بقیہ حصّہ کی تصویریں لے لی ہیں۔[27]

اب اگر جیسا کہ علامہ الکوثری نے فرمایا، مملکتِ روس میں پایا جانے والا مصحف مصحف عثمانی نہیں ہے بلکہ صحابہ کے قدیم منسوخ مصاحف میں سے ہے، تو پھر اِسے ہمارے موجودہ رائج نسخے سے رسم الخط اور بعض دوسری باتوں میں بھی مختلف ہونا چاہئے۔ اور اگر یہ درست ہے کہ روس میں پایا جانے والا مصحف، الملک الظاہر بیبرس کا کسی مغل بادشاہ کو بھیجا جانے والا نسخہ ہی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب ہمارے پاس اصل مصحف عثمانی کونسا ہے اور کہاں ہے؟

ہمارے موجودہ رائج نسخے میں قریش کے تلفظ کی صحت کے لئے جو علامات خلیل بن احمد (وفات ۱۶۰ھ) نے رائج کی تھیں یا جیسا کہ پروفیسر عبد الصمد صارم صاحب نے فرمایا کہ، وزیر ابن مقلّہ ۳۳۸ھ نے خطِ کوفی میں اصلاح کر کے جو خطِ نسخ ایجاد کیا تھا اس کے بعد پھر شاید کسی قسم کی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی، اس لئے تاریخی اعتبار سے سب سے آخری نسخہ یہی قرار پاتا ہے جو تحریری لحاظ سے ہمارے موجودہ قرآن کریم کے سفر کی آخری منزل تھی اس لئے اُس اصل

26- قومی ڈائجسٹ، سکھ تحریک نمبر، اگست ۱۹۸۴ء ص ۲۱۲۔

27- ماہنامہ فکر و نظر، ص ۴۳۵، از مضمون علامہ محمد زاہد الکوثری، ترجمہ از جناب سیّد محبوب علی شاہ، شمارہ، دسمبر ۱۹۷۰ء (ادارہ تحقیقات اسلامی)

www.RealisticApproach.org proxy http://bit.ly/Jurat

نسخے کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہو جاتی ہے میں نہیں سمجھتا کہ وہ بھی کہیں محفوظ ہو گا۔ اس لئے ہماری رائے میں اس تصحیح قرأت کا طویل سفر جو ابو الاسود الدوئلی (وفات ۶۹ھ) سے شروع ہو کر وزیر ابن مقلّہ ۳۳۸ھ پر ختم ہوا جس کے بعد اب اِن مصاحف میں سے جیسے یا جو کچھ بھی اوراق باقی بچے ہیں ان کی متعدد فوٹو کاپیاں تمام دنیا کی لائبریریوں میں محفوظ کرا دینی چاہیئں، ورنہ خدشہ ہے کہ باقی ماندہ اوراق بھی ہماری مجرمانہ غفلتوں کی نذر نہ ہو جائیں۔

اگرچہ جو اوراق اب باقی بچے ہیں وہ نہ تو خود رسول کی نگرانی میں تحریر کردہ ہیں، نہ حضرت ابو بکر صدیق کے مرتبہ مصحف کے ہیں، نہ حجاج بن یوسف والے نسخے کے ہیں، اور نہ ابو الاسود الدوئلی اور خلیل بن احمد یا وزیر ابن مقلّہ کے ہاتھوں کے آخری تحریر کردہ ہو سکتے ہیں۔ لے دے کے اب صرف حضرت عثمان غنی کے اصل سے نقل کردہ مصاحف جنہیں خود بھی رسول اللہ کی وفات کے بعد مرتب کیا گیا تھا اُس سے نقل کردہ مصاحف کو یہ کہہ کر کہ "معتبر نقول کی موجودگی میں اصل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے" اصل مخطوطات کے نشانات کو جان بوجھ کر کسی سازش کے تحت مسلسل مٹایا جاتا رہا ہے۔ اور پھر بعد میں آنے والوں کا اس عمل کو دانشمندی جیسے القابات سے نوازنا، اُن نوادرات کے ساتھ مزید ظلم کے مترادف ہے۔

"ذکر" و اذکار، نصیحت و عزت یا قرآن کی حفاظت کی اس درد بھری داستان کو پڑھ کر عرب فرمانرواؤں کی غفلت پر رونا آتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی کائنات کی سب سے بڑی متاع کی جنہیں مخطوطات کا نام دیا جاتا ہے جو قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت سے بھی کہیں زیادہ بیش قیمت تھے جنہیں خود رسول اللہ نے اپنی نگرانی میں تحریر کرایا تھا، پھر آپ کے بعد دوسرے دو خلفاء راشدین نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی دانست میں قرآن کریم کی اُن تمام غیر منسوخ آیات کو بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ جمع کیا تھا، جو رسول اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر ذکر الٰہی کے اصل ثبوت تھے اُن سب کو ضائع کر کے ان کی کیسی ناقدری کی۔

جناب پروفیسر عبد الصمد صارم (الازہری) فرماتے ہیں:

"عہدِ فاروقی میں مسلمانوں کے پاس لکھے ہوئے قرآن ایک لاکھ سے کم نہ

تھے۔" (تاریخ القرآن، ص ۱۰۴)

یقیناً یہ دورِ عثمانی سے پہلے لکھے جا چکے تھے جو حضرت عثمان غنیؓ کے نئے نسخے مرتب ہو جانے کے بعد خلیفہ کے حکم سے سب کے سب تلف کر دئے گئے تھے۔ جس کے ثبوت ہماری تمام تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ حضرت عثمان کے مرتب کردہ سات مصاحف کی تفصیل بتاتے ہوئے جناب پروفیسر عبد الصمد صارم فرماتے ہیں: "حضرت عثمان نے سات نقلیں کرائیں، ایک بطور سرکاری جلد کے اپنے پاس رکھی اسی کو مصحف الامام کہتے ہیں۔ اور باقی چھ نقلیں مکہ، بصرہ، کوفہ، یمن، شام اور بحرین کو بھیج دیں۔ (۱) مصحف الامام تاحیات حضرت عثمان کے پاس رہا، پھر (خون آلود ہو کر) حضرت علی کے پاس رہا پھر امام حسن کے پاس رہا۔ اور خلافت کے ساتھ امیر معاویہ کے سپرد ہوا۔ وہاں سے مراکش کے دارالسلطنت فاس میں پہنچا پھر کسی طرح مدینہ آگیا۔ جنگِ عظیم (اوّل) میں فخری پاشا، ترکی گورنر دیگر تبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ (جو خون آلود ہونا چاہئے) وہاں اب تک موجود ہے۔ (۲) مصحف مکی کی مولانا شبلی نعمانی نے غالباً ۱۸۹۶ء میں اپنی سیاحت کے دوران جامع دمشق میں زیارت کی تھی، جس کے بعد سلطان عبد الحمید خان کی تخت نشینی ۱۸۷۶ء اور ۱۸۹۶ء کے بعد کسی وقت مسجد میں آگ لگ جانے کے باعث وہ جل گیا۔ (۳) مصحف شامی کے بارے میں پروفیسر لکھتے ہیں کہ:

۳۷۵ھ کے بعد یہ نسخہ کوفہ سے سلاطین اندلس پھر موحدین سے امرائے بنی مرین کے قبضہ میں آیا اور جامع قرطبہ میں رہا، اہلِ قرطبہ نے اس کو سلطان عبد المومن کے سپرد کر دیا سلطان نے اسے ۵۵۲ھ میں قرطبہ سے مراکش منتقل کیا۔ ۳۷۵ھ میں خلیفہ معتمد علی بن مامون کے پاس تھا، اس کی وفات کے بعد تلمستان کے شاہی خزانہ میں پہنچ گیا، وہاں سے ایک تاجر خرید کر فاس لے آیا جو وہاں اب تک موجود ہے۔ (۴) مصحف کوفی قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں ہے۔ ۵) بصری کے بارے میں لکھا ہے: یہ مصحف کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے۔ (۶) مصحف یمنی کتب خانہ جامعہ ازہر مصر میں ہے۔ (۷) مصحف بحرین فرانس کے کتب خانہ میں (محفوظ) ہے۔" (تاریخ القرآن، ص ۱۰۵)

اس طرح حضرت عثمان کے سات مصاحف میں سے چھ یعنی آپ کا ذاتی اور کوفی، دو نسخے قسطنطنیہ ترکی میں، شامی نسخہ فاس میں، بصری اور یمنی دو مصر میں، اور بحرین والا فرانس کے کتب خانے میں کل چھ مصحف کلی یا جزوی طور پر محفوظ ہیں۔ جناب پروفیسر عبد الصمد صارم ان کے علاوہ حضرت عثمان کے تین اور نسخوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جنہیں آپ نے (دوم) (سوم) اور (چہارم) کا نام دیا ہے جو بالترتیب جامع سیدنا حسین قاہرہ مصر، کتب خانہ جامعہ ملّیہ دہلی، اور مصحف چہارم کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ اس پر لکھا ہے کہ مکتبہ عثمان بن عفان، یہ نسخہ شاہان مغلیہ کے پاس تھا اکبر بادشاہ کی اس پر مہر ہے۔ ۱۹۴۵ء میں یہ نسخہ میجر راونس کو ملا، اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیا جو اب انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کے ۱۸۱ صفحات ہیں، فی صفحہ ۱۶ سطریں ہیں سورتوں کے نام ٹیڑھے خطوط میں لکھے ہیں، اور دس آیتوں کے بعد ایک نشان ایسے حرف کی صورت میں ہے جو ایک قدیم مغربی زبان کے حروف کی طرح ہے۔ اور دو سو آیتوں کے بعد حاشیہ پر ایک نشان ہے۔ طول و عرض میں (۵.۹ x ۷۵.۶) ہے۔ اس طرح شاہان مغلیہ کے پاس ملک الظاہر بیبرس کے علاوہ ایک اور نسخہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

مصحف حضرت ابن مسعود کے بارے میں لکھا ہے کہ عبد اللہ بن مسعود نے عہد عثمانی میں تین بار مصحف لکھا، آخری بار مصحف اپنے موقف سے رجوع کر کے موافق لغت قریش پر بھی لکھا تھا۔ یہ نسخہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ یہ ہرن کی جھلی پر لکھا ہوا ہے۔ شیخ ابراہیم حمدی مدیر کتب خانہ مذکور ۳۵۷ اھ میں اس کو حیدر آباد دکن لائے تھے۔ راقم (عبد الصمد) بھی اس کی زیارت سے مشرف ہوا۔

ان کے علاوہ عہد اوّل کے اور بھی بہت سے مصاحف کا ذکر جناب عبد الصمد صارم صاحب نے اپنی کتاب، تاریخ القرآن، میں کیا ہے جو اب تک بحمد اللہ محفوظ ہیں جن میں حضرت علی، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور امام زین العابدین بن امام حسین کے متعدد مصاحف کی تفصیل اور ان کی موجودگی کے پتے بھی لکھے ہیں۔ (دیکھئے، آپکی بے نظیر کتاب تاریخ القرآن ص ۱۰۴۔۱۰۷)

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام نسخوں کی از سرے نو تحقیق و تفتیش کے بعد ہر

نسخے کے ایک ایک حرف اور جملوں کی تمام تفصیلات اور دیگر معلومات تحقیقی لحاظ سے یکجا جمع کر کے ان مصاحف کی ایک ایسی جامع رپورٹ تیار کی جائے جو تاریخ تحفظ قرآن کریم کی انسائیکلوپیڈیا کہلا سکے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے بارے میں اس وقت جو معلومات ہمیں مہیا ہیں وہ کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔

مصاحف کی پہلی داستان عہد ابو بکر سے شروع ہو کر عہد عثمانی کے ابتدائی دور پر جا کر ختم ہو جاتی ہے جن میں رسول اللہ سے لے کر صحابہ کرام کے تمام ذاتی نسخے شامل تھے اس کے بعد دوسرا دور عہدِ عثمانی کے مرتب کردہ کم از چھ مصاحف کے ساتھ بعد کے نئے تلفظ کی اصلاح کے لئے زیر، زبر، پیش اور نقطوں کی ایجاد والے تمام اصل مصاحف کی ناقدری کا دور، جو مسلمانوں کی خود اپنی غفلتوں یا دشمنانِ اسلام کی سازشوں کا ہے، جس میں ہر نقل کے بعد اصل کو مٹانے کا سلسلہ جاری رہا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے باوجود بھی ہمارے پاس متفق علیہ قرآن کریم کے لاکھوں نسخے موجود ہیں جن پر غیر مذاہب کے تمام لوگ بھی متفق ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ موجودہ قرآن کا متن اپنے قدیم عثمانی نسخے کے عین مطابق ہے اور تحریف سے قطعی پاک ہے۔ رہا ترجموں کا سوال تو اِن میں سے کسی بھی زبان کا کوئی بھی ترجمہ تحریف معنوی سے پاک نہیں ہے یہی وجہ ہے جو آج تک کسی زبان کا کوئی ترجمہ مستند قرار نہیں دیا جا سکا خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم کا کیا ہوا کیوں نہ ہو۔

البتہ ایک سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کس بات کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا؟ اگر خود رسول اللہ کے جمع کردہ تمام منسوخ اور غیر منسوخ مصاحف کا نام قرآن تھا تو وہ خود تو محفوظ نہ رہ سکے۔ اس لئے کہ رسول کریم اور دیگر صحابہ کرام کے جمع کردہ مصاحف کی موجودگی کے باوجود بھی، جنگ یمامہ میں حفّاظ کرام کی ایک بڑی تعداد کے شہید ہو جانے پر قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُن تحریر کردہ مصاحف کے علاوہ بہت سی غیر تحریر شدہ آیات ابھی بھی باقی تھیں جو اُن حفّاظ کرام کی شہادت کے ساتھ ہی ضائع ہو چکی تھیں، جس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ حفاظت والی آیت میں " ذکر " سے مراد قرآن

ہے۔ ورنہ حضرت عمر فاروق یہ جملہ ہر گز نہ فرماتے کہ " مجھے اندیشہ ہے کہ دوسری جنگوں میں بھی حفّاظ کی شہادت کا یہ سلسلہ اگر اسی طرح کچھ دن اور جاری رہا تو قرآن کریم کا اور بھی بیشتر حصّہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور ہم اُس سے (بھی اس کی طرح) ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے "یقیناً یمامہ کی جنگ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام کے ساتھ قرآن کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ایسا ہو گا جو خلافت راشدہ کے دور میں، اوّل جمع القرآن والے مصحف میں لکھا نہ جا سکا ہو۔ لہٰذا 'ذکر' سے مفہوم "قرآن" لیا جانا محلِ نظر بنتا ہے۔ اور اگر وہاں 'ذکر' سے مراد آپ کی اپنی قوم اور اجداد کے اذکار یا تذکرہ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا، جیسا کہ فرمایا" تحقیق ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی اس میں تمہارا اپنا ہی ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں" (انبیاء:۱۰) یا جیسا کہ فرمایا " بے شک اللہ نے چن لیا، آدم اور نوح اور اولادِ ابراہیم اور اولادِ عمران کے گھرانے کو عَلَی العٰلَمِین جو آپس میں ایک دوسرے کی اولاد تھے۔" (اٰل عمران:۳۳۔۳۴) یا فرمایا گیا، " ہم نے (اس کتاب کے ذریعہ) آپ کے ذکر کو بلند کیا"(الم نشرح:۴) کیونکہ قرآن کریم میں اُس قوم کے لئے جسے ایک باپ کی اولاد ہونے کے ناطے امتِ واحدہ بھی کہا گیا تھا شرعی احکامات کے علاوہ جتنی بھی باتیں ہیں، اُن سب کا تعلق خالصتاً ذرّیتِ ابراہیم، صلہ رحمی (یعنی اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے محبت رکھنا اور بہتر سلوک کرنا) اور اپنے اُس علاقے کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے قومی اتحاد سے ہے جن کی حیثیت ایک خاص قوم کے ذاتی معاملات اور سیاسی جدوجہد کی تاریخ سے ہے جو ایک خاص وقت کے لئے ہی مناسب حال تھیں۔ قرآن کریم کی اپنی آیت (الانبیاء:۱۰) پر غور کرتے ہیں تو اس کتاب کی تعریف حضرت ابراہیم کے جدامجد حضرت آدم صفی اللہ کی اولاد کا "تذکرہ" معلوم ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا"(اے نبی) تحقیق ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی اس میں تمہارا اپنا ہی ذکر ہے" جو اُس وقت ایک خاندان کے اپنے ہی ماضی اور حال کے تذکروں سے پُر ہے گویا یہ آیت قرآن کا خود اپنا کرایا ہوا تعارف ہے۔ رہا سوال اُس وقت کے سیاسی عمل کا تو وہ اب عرب میں بھی بعینہ حرف با حرف دہرایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے شریعت کے علاوہ اس کے باقی حصّے کی حفاظت کا مقصد عربوں کی اپنی

تاریخ وادب کی حفاظت کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جنہیں تمام جہانوں میں سے چنندہ اقوم کے لئے فرمایا "بے شک اللہ نے چن لیا، آدم اور نوح اور اولادِ ابراہیم اور اولادِ عمران کے گھرانے کو عَلَى الْعٰلَمِينَ (تمام اقوم عالم سے جدا کر کے) جو آپس میں ایک دوسرے کی اولاد تھے۔" (۳: ۳۳۔۳۴) اگر بائبل میں مذکور آدم تمام بنی نوع انسان کے مشترکہ باپ ہوتے تو یہاں صرف آدم اور بنی آدم کہہ دینا ہی کافی ہو جاتا، الگ الگ آدم، نوح، ابراہیم اورآلِ عمران کہنے کی ضروت پیش نہیں آتی۔ جنہیں "انَّ هٰذِهٖ اُمَّتُکُم اُمَّةً وَّاحِدَةً" (المومنون:۵۲) بے شک یہ سب کے سب ایک ہی باپ آدم صفی اللہ اور حضرت ابراہیم "ملّة ابیکُم ابراھیمَ" کے افراد تھے جن کی مخصوص تاریخ کا 'ذکر' تورات انجیل اور قرآن میں بھرا ہوا ہے۔ جس سے دنیا کی دیگر اقوام کو سوائے تاریخی دلچسپی کے اور کیا سروکار ہو سکتا ہے؟

اس تمام بحث سے غالباً یہ بات اب صاف ہو چکی ہو گی کہ اس آیت میں 'ذکر' سے مراد کاغذ یا دیگر کسی چیز پر، قلم اور سیاہی کی مدد سے لکھے ہوئے الفاظ نہیں ہیں اور نہ ہی حفّاظ کے سینوں میں محفوظ کلام، جو وقت کے ساتھ ساتھ برابر مٹتے رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم کسی شئے کے بارے میں یہ دعویٰ کریں کہ یہ ہمیشہ محفوظ رہے گی تو اُس اصلی شئے کو ہی ہمیشہ محفوظ رہنا چاہیئے نہ کہ اُس کی نقل در نقل کو۔ مثلاً تاج محل کا معمار اپنے بنائے ہوئے تاج محل کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کرتا کہ یہ اب تا قیامت آج کی طرح ہمیشہ ہمیشہ محفوظ اور قائم رہے گا، لیکن وہ امتداد زمانہ، غفلت یا کسی حادثے کی بنا پر محفوظ نہ رہ سکتا اور پھر ہم اس کی ہوبہو بلکہ اصل سے بھی بہتر نقل تیار کر لیتے اور یہ کہتے کہ یہ اُس معمار کے دعویٰ کی سچائی ہے تو کیا یہ درست ہوتا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ حمورابی کے قوانین آج بھی اپنی اصل حالت میں جوں کے توں محفوظ ہیں، اگرچہ اُس نے ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے خدا سے ایسے کسی دعوے کو اپنی کسی غلط فہمی کی بنا پر منسوب کرنا اس کی شانِ خداوندی پر حرف گیری کا موقعہ فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ تفہیم القرآن سے متعلق ہماری اس قسم کی تمام کوتاہیوں پر خدا ہم سب کو معاف کرے کہ ان سب کا تعلق ہمیشہ ہمارے اخلاص سے ہی رہا ہے۔

آج موجودہ صورتِ حال میں دنیا کی تمام اسلامی حکومتوں کو چاہئے کہ وہ سب مل کر قرآن کریم کے مخطوطات سے متعلق جو کچھ بھی اس وقت بچا رہ گیا ہے اُسے از سرِ نو محفوظ کر کے فوٹو گرافی کی مصدّقہ نقول کی مدد سے ایک نیا انسائیکلوپیڈیا تیار کرائیں جو دنیا کے بڑے شہروں کے کتب خانوں میں دستیاب ہوں اور ماضی کے بر خلاف اصل مخطوطات کو مکمل معلومات کے ساتھ مختلف ممالک میں شاہی نوادرات کی طرح الگ الگ خزانوں میں محفوظ کرائیں جن میں خصوصاً حضرت عثمان غنی کے مرتب کردہ نسخوں سے پہلے اور پھر آپ کے مصاحف کے بعد معاویہ کے زمانہ خلافت کے ابوالاسود اور ان کے بعد عبدالرحمٰن خلیل بن احمد ۱۱۰ھ وفات ۱۷۰ ھ تک کے تمام اصل مصاحف جن پر پہلی بار نقطے، زیر، زبر، پیش اور دیگر علامات لگائی گئیں تھیں الگ محفوظ کیے جائیں کیونکہ ان کے بعد کے تمام مصاحف انہی کی نقول ہیں۔

Jurat-e-Tehqiq

جرأتِ تحقیق ایک مقصد اور پیغام کا نام ہے، جہاں جرأت اور تحقیق کے ساتھ سچ اور حقیقت کو واضح کر کے سچائی اور حقیقت پسندی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ جہاں سوال پوچھے جاتے ہیں اور سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اور عقل و خرد کی روشنی میں ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خرد افروزی اور حقیقت پسندی کے اسی "جرم" کے سبب جرأتِ تحقیق کو پاکستان میں بند کر دیا گیا ہے، ذرائع ابلاغ کی آزادی کے اس دور میں اس طرح کی پابندیاں اب کوئی معنی نہیں رکھتیں، آپ http://bit.ly/Jurat کے لنک کے ذریعے بآسانی جرأتِ تحقیق کی ویب سائٹ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔